الٰہی تا بود خورشید و ماہی
چراغِ چشتیاں را روشنائی

کشکولِ کلیمی

حضرت الشیخ کلیم اللہ چشتی جہاں آبادی قدس سرہٗ

مکتبہ نبویہ ○ گنج بخش روڈ لاہور

کشکول کلیمی
حضرت الشیخ کلیم اللہ چشتی جہاں آبادی قدس سرہ
مکتبہ نبویہ ○ گنج بخش روڈ لاہور

نام کتاب ——— کشکول کلیمی

نام مؤلف ——— حضرت شاہ کلیم اللہ شاہجہان آبادی قدس سرہٗ

موضوع ——— سلوک سلسلۂ چشتیہ

ترجمہ ——— محمد سمیع اسمٰعیل ایم اے

مقدمہ ——— پروفیسر خلیق احمد نظامی

سال طباعت اوّل دوئم ——— ۲۰۰۰ء / ۱۴۲۱ھ

صفحات ——— ۱۶۰

طابع ——— کاروان پریس لاہور

ناشر ——— مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ لاہور

قیمت ——— ۹۰ روپے

فہرست عنوانات

کتاب کشکول کلیمی

احوال و مقامات

حضرت شاہ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی رح

۱۶۵۰—۱۷۲۹

پروفیسر خلیق احمد نظامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت شاہ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادیؒ کو چشتیہ سلسلہ کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت اور عظمت حاصل ہے۔ ان کے زمانے سے چشتیہ سلسلہ کا دورِ تجدید و احیاء شروع ہوتا ہے۔

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے بعد چشتیہ سلسلہ کا مرکزی نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ اور صوبوں میں مرکز سے غیر متعلق خانقاہیں قائم ہو گئی تھیں حضرت سید محمد گیسو درازؒ، حضرت نور قطب عالمؒ، علامہ کمال الدینؒ اور دیگر مشاہیر نے سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی جد و جہد کی تھی۔ لیکن سلسلہ کو ایک "کل ہند ادارہ" کی حیثیت سے زندہ نہ کر سکے تھے۔ مرکزیت کے فنا ہو جانے سے سلسلہ کے نظام کی اساس و بنیاد ہی بدل گئی تھی، شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کا یہ کارنامہ تھا کہ انھوں نے چشتیہ سلسلہ کے بے ترتیب نظام میں پھر ایک بار باقاعدگی

پیدا کی اور متقدمین صوفیہ کی نہج پر تبلیغ و اشاعت اور اصلاح و تربیت کا کام شروع کر دیا۔ انھوں نے ملک کے دور دراز علاقوں میں اپنے خلفا بھیجے اور ان کے ذریعے ایک گرتی ہوئی سوسائٹی کو انتشار و ابتری سے بچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ چشتیہ سلسلہ کا نشاۃ ثانیہ اُن ہی کی کوششوں کا رہین منت تھا۔

حضرت شاہ صاحب رح نے رشد و ہدایت کی شمع ایسے زمانے میں روشن کی تھی۔ جب ہندوستان کے مسلمان ایک نہایت ہی نازک دور سے گزر رہے تھے۔ سلطنت مغلیہ کا آفتاب غروب ہوا چاہتا تھا، معاشرہ پر انحطاطی رنگ چھا رہا تھا، زندگی 'سکرِ دوام' میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ہر شخص ایک گونہ بے خودی کے عالم میں مست و خراب تھا۔ مذہب کی روح ختم ہو چکی تھی اور اگر کچھ باقی رہ گیا تھا تو اوہام کا تار و پود۔ شاہ صاحب رح نے تنزل اور انحطاط کے اس دور میں احیاء ملت اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے جو کوششیں کیں وہ اسلامی ہند کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ وہ حالات کی نامساعدت کو پہچانتے تھے زمانے کی رفتار کو دیکھتے تھے، لیکن ہمت نہ ہارتے تھے اور پکار پکار کر کہتے تھے

"در اعلائے کلمۃ الحق باشید و جان و مال خود صرف ایں کار کنید"[۵۱]	اعلاء کلمۃ الحق میں مصروف رہو اور اپنے جان و مال کو اسی میں صرف کر دو۔

دہلی کے مشہور بازار خانم[۵۲] میں اُن کی خانقاہ تھی۔ خانقاہ کیا تھی

---

۵۱ مکتوب ۱۲ ص ۲۶

۵۲ "خانم کا بازار بھی ایک بہت بڑا اور پُررونق بازار تھا جو قلعے (بقیہ صفحہ ۳۶۸ پر)

علم و معرفت، رموز و حکمت، احسان و سلوک کا سرچشمہ تھی، ہزاروں تشنگان معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے وہاں آتے تھے۔ شائقین علم و فضل اُن کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونا باعثِ فخر و مباہات تصور کرتے تھے میر غلام علی آزاد بلگرامیؒ کا بیان ہے :-

"امرا و فقرا حلقۂ اعتقاد در گوش داشتند، و بہ مطالب دینی و دنیوی کامیاب اند و ختند[۵]	امیر اور فقیر (سب ہی) اُن سے نیازمندانہ اعتقاد رکھتے تھے، اور دینی و دنیوی مقاصد میں کامیابی حاصل کرتے تھے۔

شاہ صاحبؒ کے علمی اور روحانی دونوں مراتب نہایت اعلیٰ تھے۔ لوگ اُن کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ ماثر الکرام میں لکھا ہے :-

"در علوم عقلی و نقلی پایۂ بلند و در حقائق و معارف رتبۂ ارجمند داشت[۵۲]	علوم عقلی اور نقلی میں اُن کا پایہ بلند اور حقائق و معارف میں ان کا رتبہ ارجمند تھا۔

(بسلسلہ صفحہ ۳۶) کی فصیل کے برابر سرادگیوں کے مندر تک چلا گیا تھا۔ جہاں اب ٹھنڈی سڑک ہے۔ یہ سارا میدان بھی صاف ہوگیا۔ غرض یہ کہ جامع مسجد کے دروازہ شرقی کے محاذ میں جو صاف اور چٹیل میدان نظر آتا ہے یہ حصہ فوجی اغراض اور دور اندیشی سے عمارات سے صاف کر دیا گیا۔ اس میں اب ایڈورڈ پارک بنایا ہے، اور پریڈ گراؤنڈ ہے۔"

واقعات دارالحکومت، دہلی

جلد دوم۔ ص ۱۲۳

سلہ و سلہ ۵۲ ماثر الکرام ص ۲۰۴

شاہ صاحبؒ کے اسلاف معماری کا پیشہ کرتے تھے لیکن خود ان کو بقول آزاد "اللہ تعالےٰ نے دلوں کی معماری کے لئے مخصوص کیا تھا" خود ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :-

"بادشما کار فراہم آوردن ٹنکہ و نقد و جنس نیست، فراہم آوردن دلہا مطلوب است" [51]	ہمارا اور تمہارا کام ٹنکہ و نقد و جنس جمع کرنا نہیں ہے بلکہ دلوں کا اکٹھا کرنا مقصود ہے ۔

یہی وہ کام ہے جو تصوف کی روح اور اخلاق کی جان ہے اور جس کی اہمیت حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے مولانا فخرالدین مروزیؒ کو ایک مکتوب میں سمجھائی تھی [52]

شاہ کلیم اللہؒ کا خاندان | مناقب المحبوبین میں لکھا ہے :-

"نام پدر ایشاں حاجی نور اللہ بن شیخ احمد بن شیخ حامد صدیقی از اولاد حضرت ابابکر صدیق رضی اللہ عنہ اند، اباو اجداد ایشاں ساکنان شہر خجند بودند، پدر ایشاں در زمان سلطنت سلطان شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ دہلی در شاہجہاں آباد یعنی دہلی نو آمدہ بود، دربارر	ان کے والد کا نام حاجی نور اللہ بن شیخ احمد بن شیخ حامد صدیقی تھا وہ حضرت ابوبکرؓ کی اولاد سے تھے ۔ اُن کے اباو اجداد خجند کے رہنے والے تھے .... اُن کے باپ شاہجہاں کے زمانے میں شاہجہاں آباد میں آئے ، وہ علم نجوم اور ہیئت میں انتہائی کمال

51 مکتوبات کلیمی م ۴۳ ص ۳۶

52 ملاحظہ ہو، سیر الاولیاء

ایشاں در علم نجوم و ہیئت کمالیت تمام	رکھتے تھے۔ اسی بنا ر پر شاہجہان نے
داشت، بنا براں بادشاہ مذکور بہ وقت	لال قلعہ کی تعمیر کے وقت اُن کو
تعمیر لال قلعہ ایشاں را از شہر خجند طلبیدہ بود[1]	شہر خجند سے طلب کیا تھا۔

شاہ کلیم اللہ کے دادا احمد معمار[2] عہد شاہجہانی کے مشہور ماہرینِ فن میں تھے شاہانِ مغلیہ کی طرف سے نادر العصر کا خطاب ملا تھا۔ اقلیدس، ہیئت، نجوم، ریاضی وغیرہ پر کامل عبور رکھتے تھے، یونانی ریاضیات کی سب سے اونچی کتاب مجسطی اور خواجہ نصیر طوسی کی تحریر اقلیدس کے عالم تھے۔ ان کے بیٹے لطف اللہ مہندس نے (جو شاہ کلیم اللہ کے تایا تھے) ایک مثنوی میں اُن کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

شاہجہاں داورِ گیتی ستان	روشنی دودۂ صاحب قرآں
عرش بریں قبہ خرگاہ اوست	رشک فلک سدۂ درگاہِ اوست
احمد معمار کہ در فن خویش	صدقدم از اہلِ ہنر بود بیش
واقفِ تحریر و مقاماتِ آں	آگہ اشکال و حوالاتِ آں
از طرفِ داور گردوں جناب	"نادر عصر" آمدہ اورا خطاب
بود عمارت گرِ آں پادشاہ	داشت درآں حضرت فرخندہ راہ

---

[1] مناقب المحبوبین۔ ص ۵۴

[2] احمد معمار اور ان کی اولاد کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے چند مضامین میں کافی مفید معلومات جمع کر دی ہے (معارف فروری، مارچ ۱۹۳۶ء نیز مئی ۱۹۳۷ء اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۷ء) ان مضامین سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے لیکن ان دونوں مضمون نگاروں میں سے کسی کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ احمد معمار کے خاندان کی سب سے بڑی شخصیت شاہ کلیم اللہ دہلوی تھے

تاج محل اور لال قلعہ کو انھی نے تعمیر کیا تھا اسی مثنوی میں لکھتے ہیں ؎

کرد بحکم شہِ کشور کشا | روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکم شہِ انجم سپاہ | شاہجہاں داورِ گیتی پناہ
قلعہ دہلی کہ ندارد نظیر | کرد بنا احمدِ روشن ضمیر

احمد معمار نے ۱۰۵۹ھ میں انتقال کیا[۵۱] ان کے تین بیٹے ۔

(۱) عطاء اللہ

(۲) لطف اللہ

(۳) نور اللہ

تینوں اپنی اپنی جگہ اُستاد تھے[۵۲] ۔ عطاء اللہ کے متعلق مثنوی میں لکھا ہے ؎

نادرِ عصر خود و مشہور شہر | عالم و علامہ و دانائے دہر
مردِ ہنر پرور و اُستادِ فن | فاضل و دانشور و حبرِ زمن
مخزنِ علم آمدہ تالیف او | گنج ہنرہاست تصانیفِ او
نثرِ او از آب رواں پاک تر | نظم خوشش غیرتِ سلکِ گہر

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم اور نثر دونوں میں عطاء اللہ کو کمال حاصل تھا

لطف اللہ نے اپنے بڑے بھائی سے تعلیم حاصل کی تھی اس لئے کہتے ہیں ؎

---

[۵۱] لکھا ہے ۔ درزمانِ سعید شاہجہاں | شاہ علم پناہ جم مقدار
نادر العصر رفت و گفت خرد | شد بفردوس احمدِ معمار

۱۰۵۹ھ

[۵۲] ماہمہ معمار و عمارت گریم
ماہمہ استاد سخن پروریم

منکہ سخن پرورِ دانش درم | بندۂ آں جز سخن درم
منکہ ربودم زجہاں گوئے علم | ازجہنش یافتہ ام بوئے علم

لطف اللہ علم ہندسہ کے ماہر تھے۔ مہندس خطاب شاہی تھا۔ شعروشاعری کا بڑا ذوق تھا۔ اس مثنوی میں جس کے اقتباسات اوپر پیش کئے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے شاعرانہ کمالات کے جوہر دکھائے ہیں۔

احمد معمار کے سب سے چھوٹے بیٹے نور اللہ تھے، جو شاہ کلیم اللہ کے والد بزرگوار تھے۔ عمر میں لطف اللہ سے چھوٹے تھے، لیکن کمالات میں اُن سے بڑھ کر تھے۔ چنانچہ خود لطف اللہ لکھتے ہیں ؎

لیک بود قصرِ کلامش عجب | زاں شدہ معمار مراو را لقب
گرچہ کم است سالِ وے از سالِ من | بیش بود حالِ وے از حالِ من
نثرِ وے از نظم گہر بار تر | نظم ز نثر آمدہ ہموار تر
دیدہ زنورِ سخنش پرضیا | طبع ز لطفِ سخنش پرصفا
گنج ہنر آمدہ در مشتِ او | ہفت قلم راندہ سہ انگشتِ او
گرچہ منم بے سخن استادِ فن | آں یک و ایں یک بود استادِ من

دہلی کی جامع مسجد کی پیشانی پر جو کتبے ہیں وہ نور اللہ ہی کی باکمال انگلیوں کا کرشمہ ہیں۔ کتبہ کے آخر میں بسمت شمال لکھا ہوا ہے۔

کتبہ نور اللہ احمد

خاندانِ کلیمی کے تعمیری کارنامے | خاندانِ کلیمی کے تعمیری کارنامے مندرجہ ذیل ہیں

(۱) تاج محل۔ آگرہ

(۲) لال قلعہ۔ دہلی

(۳) جامع مسجد، دہلی

(۴) محل نواب آصف خاں، لاہور

(۵) قلعہ جات شمشیر گڈھ اور حسن ابدال

(۶) مقبرہ دلراس بانو بیگم، اورنگ آباد

خاندان کلیمی کے علمی کارنامے | اس خاندان نے صرف سنگ و ستون ہی پر اپنا نقشِ دوام نہیں چھوڑا۔ اس کی یادگار چند کتابیں بھی ہیں جو اپنی جگہ اہم ہیں اور جن سے اِس خاندان کی علمی دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

عطاءاللہ، رشیدی تخلص کرتے تھے اور نظم و نثر میں متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں۔ ریاضی پران کی جن تین کتابوں کا علم ہو سکا ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) بیج گنت

(۲) خلاصہ راز

(۳) خزینۃ الاعداد

بیج گنت[۵] بھاسکراچاریا کی سنسکرت تصنیف ویجاگنیتا کا فارسی ترجمہ ہے۔ ویجاگنیتا کے معنی علم جبر و مقابلہ کے ہیں۔ عطاءاللہ نے یہ ترجمہ شاہجہاں کے آٹھویں سنہ جلوس یعنی ۱۰۴۴ھ میں مکمل کر لیا تھا۔

خلاصہ راز[۵۲] میں حساب، مساحت اور جبر و مقابلہ سے متعلق مضامین ہیں۔ رسالہ شاہزادہ داراشکوہ کے نام معنون کیا گیا ہے۔

---

[۵] قلمی نسخے برٹش میوزیم اور میونخ یونیورسٹی کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

[۵۲] قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

خزینۃ الاعداد علم حساب، الجبرا اور اقلیدس میں ہے۔ یہ کتاب مبتدیوں تاجروں
اور سرکاری ملازموں کے لئے لکھی گئی تھی۔
لطف اللہ کی مندرجہ ذیل تصانیف ہم تک پہنچی ہیں۔

(۱) صورِ صوفی

(۲) رسالہ خواص اعداد

(۳) شرح خلاصۃ الحساب

(۴) منتخب الحساب

(۵) تذکرہ آسمان سخن

(۶) دیوانِ مہندس

(۷) سحرِ حلال

صورِ صوفی، عبدالرحمٰن صوفی (المتوفی ۳۷۶ھ) کی مشہور کتاب صورالکواکب کا فارسی ترجمہ ہے۔ لطف اللہ نے ۱۰۸۰ھ میں اپنے باپ کے حکم سے اس کام کو انجام دیا، اور ان ہی کے نام سے اس کو معنون کیا۔ اس کا اصل نسخہ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔
رسالہ خواص اعداد، سات صفحات پر مشتمل ہے۔ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں ایک مجموعہ کے اندر شامل ہے۔
شرح خلاصۃ الحساب۔ بہاء الدین محمد بن حسین آملی کی عربی تصنیف خلاصۃ الحساب کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں

لـہ اس کا قلمی نسخہ اسی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے (۱۰۰۱)،
ملاحظہ ہو: فہرست کتب عربی، فارسی و اردو کتب خانہ جامعہ بمبئی مترجمہ شیخ عبدالقادر

ہے۔ اور دوسرا رامپور کے کتب خانے میں۔

منتخب الحساب، بہاء الدین آملی کی کتاب کا فارسی خلاصہ ہے۔ اس کے دو نسخے انڈیا آفس کے کتب خانے میں، ایک برٹش میوزیم۔ ایک کتب خانہ آصفیہ اور ایک مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

آسمان سخن، دولت شاہ سمرقندی کے فارسی تذکرے کو اکبر کے زمانے میں ایک شاعر فائضی کرباتی نے دس طبقوں میں مکمل کیا تھا۔ لطف اللہ نے دو طبقات کا اس میں اضافہ کرکر اس کا نام آسمان سخن رکھ دیا۔ اس کا ذکر ڈاکٹر اسپرنگر نے شاہان اودھ کے کتب خانے کی فہرست میں کیا ہے۔

دیوانِ مہندس، ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، ایک قصیدہ میں دارا شکوہ کی تعریف کی ہے۔

سحر حلال، علمِ اخلاق میں غیر منقوطہ رسالہ ہے۔ زبان فارسی ہے۔ عالم گیر کی تعریف کی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لطف اللہ کے دارا شکوہ سے تعلقات کے پیش نظر عالم گیر کو اس سے مخالفت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک جگہ لکھا ہے ؎

شہا گوش بر داد خواہی نداری بحال گدایاں نگاہے نداری
رقیباں بقتلم نوشتند فتوے وگرنہ تو ہرگز گناہے نداری

غالباً تعلقات کو درست کرنے کے لئے لطف اللہ نے سحر حلال کی تصنیف کی تھی، اس کا قلمی نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

لطف اللہ کے دو بیٹے تھے:۔

(۱) امام الدین [illegible]ی

(۲) خیر اللہ

امام الدین کا ذکر شاہ کلیم اللہؒ نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ

چاہتے تھے کہ امام الدین کی ایک لڑکی کا نکاح اپنے عزیز مرید شیخ نظام الدین اورنگ آبادی سے کرادیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

سخن صریح تر آنکہ میاں امام الدین	صاف بات یہ ہے کہ میاں امام الدین
کہ برادر عموزادہ فقیر اند، دخترے	کی جو فقیر کے عموزادہ ہیں۔ ایک
درسن چہاردہ سالہ فی الحال	لڑکی ہے جو ۱۴ سال کی ہے، نماز
بصلاح نماز و روزہ و تلاوت	روزہ تلاوت قرآن سے آراستہ
قرآن آراستہ دارند.....[۵۱]	ہے۔

امام الدین کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے :۔ ریاضیات کے اس ریاضِ علم کا یہی وہ نونہال ہے جس کے تذکرے کی خوشبو بارہویں صدی کے اہل تذکرہ کی محفل تک پھیلی ہے "[۵۲] ان کے حالات خوش گو، حسین قلی خاں عظیم آبادی کشن چند اخلاص اور احمد علی خاں سندیلوی نے لکھے ہیں۔ خوش گو کا بیان ہے:

"درجمیع علوم رسمی یگانہ و منفرد بود"

پھر آگے لکھا ہے :۔

"دریں جزو زماں از مغتنمات بودہ"

امام الدین نے ۱۱۴۵ھ کو انتقال کیا۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف اب تک دریافت ہو سکی ہیں :۔

(۱) تشریح الافلاک

(۲) حاشیہ شرح چغمنی

---

۵۱ مکتوبات کلیمی۔ م ۷، ص ۱۵

۵۲ معارف۔ اپریل ۱۹۳۶ء ص ۲۴۵

(۳) حاشیہ شرح خلاصۃ الحساب

(۴) بیانیہ

تشریح الافلاک، بہاء الدین آملی کی تصنیف کی شرح ہے۔ رامپور میں اس کے دو نسخے موجود ہیں۔ بیانیہ۔ معانی و بیان سے متعلق ہے۔ رسالہ کی زبان فارسی ہے دیباچہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ شہزادی زیب النساء بیگم کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔

ابوالخیر معروف بہ خیر اللہ، محمد شاہ کے زمانے میں مشہور ہوئے، راجہ جے سنگھ نے بادشاہ کے حکم سے دہلی، جے پور، بنارس، اجین میں جو رصد خانے قائم کئے تھے۔ اُن کی نگرانی خیر اللہ ہی نے کی تھی ۔ وہ دہلی میں درس بھی دیتے تھے۔ محمد علی ان کے بیٹے اور شاگرد تھے۔ وہ بھی اپنے فن میں بڑے مشہور تھے۔ اُن کے بعد کسی شخص کو اتنی شہرت اس خاندان میں حاصل نہیں ہوئی۔ خیر اللہ کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) تقریر التحریر[۵۱]

(۲) تقریب التحریر[۵۲]

(۳) حاشیہ بر شرح مبیت باب در معرفت اسطرلاب[۵۳]

---

۵۱ قلمی نسخہ۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ (حیدر آباد) اور انڈیا آفس (نمبر ۲۳۶۰ ۲)

۵۲ قلمی نسخہ بانکی پور (۱۰۵۸) اور علی گڑھ

فہرست میں اس کا نام ترجمہ مجسطی لکھا ہے (نمبر ۶ علوم فارسی)

۵۳ یہ حواشی بانکی پور لائبریری کی شرح بست باب کے نسخے نمبر ۱۰۴۵ کے کناروں پر درج ہیں۔

(۴) شرح زیچ جدید محمد شاہی [۵۱]
(۵) شرح زلالی [۵۲]
(۶) شرح حافظ [۵۳]
(۷) شرح سکندر نامہ [۵۴]

شاہ کلیم اللہؒ کی ولادت | حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ کی ولادت باسعادت ۲۴ رجمادی الثانی ۱۰۶۰ھ ۱۶۵۰ء کو ہوئی تھی۔ خود ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:-

"بست و چہارم جمادی الثانی مولد فقیر است و تاریخ تولد فقیر غنی است"[۵۵]

(۱۰۶۰ = ۱۰ + ۵۰ + ۱۰۰۰)

تعلیم و تربیت | شاہ صاحبؒ کی تعلیم و تربیت بہت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ خود انھوں نے ابتدائی زمانے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے اکتسابِ علوم کیا تھا تکملہ سیر الاولیاء میں لکھا ہے:-

"ایام جوانی بہ تحصیل علوم مشغول بودند و کمال علم کردہ بودند"[۵۶]

ان کے اساتذہ میں شیخ برہان الدین المعروف بہ شیخ بہلولؒ اور شیخ ابوالرضا الہندیؒ کے اسماء گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شیخ بہلولؒ

---

۵۱ اس شرح کا حوالہ علامہ حسین جون پوری نے اپنی مشہور تصنیف جامع بہادر خانی میں دیا ہے

۵۲ ۵۳ ان شرحوں کا ذکر تقریب التحریر کے دیباچہ میں ان کے بیٹے نے کیا ہے۔

۵۴ مطبع شرف المطابع دہلی سے ۱۲۶۹ھ میں طبع ہوئی۔

۵۵ مکتوبات کلیمی۔ ص ۹۳ مکتوب ۱۲۵

۵۶ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۷۹

سید محمد غوث گوالیاری رح کی اولاد سے تھے۔ اُن کے علمی تبحر کی دور دور شہرت تھی شیخ ابوالرضا الہندی رح، شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے تایا تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد کے ذہن و قلب پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اُن ہی کے ذریعے سے شاہ کلیم اللہ دہلوی کا رشتہ خاندان ولی اللّٰہی سے قائم ہو جاتا ہے۔

شیخ ابوالرضا الہندی شیخ وجیہہ الدین شہید کے فرزند رشید اور شاہ عبدالرحیم صاحب رح کے بڑے بھائی تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل حافظ بصیر کی نگرانی میں کی۔ حافظ بصیر اُس زمانے میں اپنے علمی تبحر کی بنا پر بڑی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے[2] ان کے فیض صحبت سے شیخ ابوالرضا رح نے بہت جلد علوم ظاہری میں دستگاہ حاصل کرلی۔ پھر خواجہ خرد خلف الصدق حضرت خواجہ باقی باللہ رح کی خدمت میں سلوک و معرفت کی دشوار گزار راہیں طے کیں۔ ابتدائی زمانہ میں امرا سے میل جول رکھتے تھے اور شاہی دربار میں ایک ممتاز عہدہ بھی قبول کرلیا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس زندگی سے طبیعت گھبرا گئی اور انھوں نے مسجد فیروز آباد کے قریب ایک حجرے میں رہنا شروع کردیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب رح اس زمانے کا حال لکھتے ہیں:-

> "درآں زماں بسیار می بود کہ دو سہ فاقہ متواتر می گزشتند و اگر سد رمقے میسر می آمد چند تائے نان جویں و دوغ می بود کہ محمد جان طحان و امثال وے از نیاز مندان می آوردند و آنرا در فقرا قسمت علی السویہ

---

[1] حالات کے لئے ملاحظہ ہو گلزار ابرار قلمی

[2] شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:-

حافظ بصیر کہ عمدۂ علمار زمان شاہجہاں بود۔ انفاس العارفین ص ۸۰

می کردند و بقلیلے اکتفا می نمودند"[51]

اس کے بعد فتوحات کی ایسی کثرت ہوئی کہ ہر طرح کی سہولت حاصل ہوگئی۔

شیخ ابوالرضاؒ اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ علومِ عقلی و نقلی کے ہر گوشہ پر کامل عبور رکھتا طبیعت کا زیادہ رجحان تصوف کی طرف تھا اکثر اوقات شغل افکار میں انہماک رہتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ درس و تدریس کا بھی شوق تھا، اور جو شائقین علم حاضر ہوتے تھے، ان کی تشنگی کو دور کرنے کے لئے اس طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ آخری زمانے میں تفسیر بیضاوی اور مشکوٰۃ شریف کے علاوہ کسی کتاب کا درس دینا پسند نہ کرتے تھے[52] وعظ میں بڑی تاثیر تھی۔ نماز جمعہ کے بعد ہمیشہ وعظ کہتے تھے۔ جن میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین موجود ہوتے تھے۔ احادیث شریف کراُن کا فارسی' اور 'ہندی' میں ترجمہ کرتے جاتے تھے[53] اور ایسے پُر درد لہجے میں خطاب کرتے تھے کہ سُننے والوں کے دل ہل جاتے تھے۔

شیخ ابوالرضاؒ وحدتِ وجود کے قائل تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا بیان ہے:-

"اکثر حالی در توجہ الی اللہ یا بیان معارف با خواص اصحاب می گذشت، بوحدتِ وجود قائل بودند و دراں باب تحقیقے عظیم داشتند، و در مجالسِ صحبت مغلقات کلام صوفیہ رابسیار حل می فرمودند"[54]

---

[51] انفاس العارفین ص ۸۸

[52] "در آخر بجز دو سبق یکے از تفسیر بیضاوی و دیگر از مشکوٰۃ درس ایشان نبود"

انفاس العارفین۔ ص ۹۰

[53] انفاس العارفین ۔ ص ۹۰

[54] انفاس العارفین ۔ ص ۹۰

استغنا کا یہ عالم تھا کہ اورنگ زیب نے متعدد بار اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن قبول نہ ہوئی۔ شیخ ابوالرضا رح کے تفصیلی حالات، شوارق المعرفت اور انفاس العارفین میں مطالعہ کرنے چاہئیں۔

مدینہ منورہ کو روانگی | تکمیلِ علوم کے بعد، شاہ کلیم اللہ رح کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا اور وہ یک لخت مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے۔ حافظ محمد جمال ملتانی رح سے روایت ہے کہ اوائلِ عمر میں ان کو ایک کھتری لڑکے سے گرویدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اور عشق اس درجے تک پہنچ گیا تھا کہ ایک لمحہ بھی اس کے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔ دلی میں ایک مجذوب تھے۔ جن کے متعلق عام عقیدہ یہ تھا کہ وہ صرف اسی شخص کی نذر قبول کرتے ہیں۔ جس کا کام ہونا ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کچھ شیرینی لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے یہ نذر قبول کر لی۔ دوسرے دن شاہ صاحب رح اس لڑکے کے پاس گئے۔ اس نے نہایت ہی لطف اور توجہ سے اُن کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑی محبت سے پیش آیا۔ لڑکے کی اس بالاطفت سے شاہ صاحب رح کی طبیعت بھر گئی، اور ان کے مذہبی احساس نے پکار کر کہا

ہمتِ عشق نہ ہو حسنِ خط و خال میں بند
صید ہر مور و مگس ہوتے ہیں شہباز کہیں (قائم چاندپوری)

اب شاہ صاحب رح کی طبیعت اس مجذوب کی طرف راغب ہو گئی۔ مجذوب کی صحبت سے شاہ صاحب رح میں ایک جذب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ احترامِ شرع کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنی حالت کو چھپانے کی حد سے زیادہ کوشش کرتے تھے۔ لیکن جب ضبط نہ ہو سکا اور بالکل مجبور ہو گئے تو مجذوب سے اپنی حالت بیان کی اور امداد کے طالب ہوئے۔ اُنھوں نے جواب دیا :-

اگر آتش ازیں قسم خواہند — اگر اس قسم کی آگ چاہتے ہو تو

نزدمن بسیار است و آب	میرے پاس بہت ہے (لیکن)
نزد حضرت شیخ یحییٰ مدنی است	پانی حضرت شیخ یحییٰ مدنی کے پاس
آنجا روید"	ہے۔ وہاں جاؤ۔

شاہ صاحبؒ جن کا قلب وجگر اس آگ سے پہلے ہی جل چکا تھا اور جن کی تشنگی کسی ابرِکرم کی منتظر تھی، شیخ یحییٰ مدنیؒ کا نام سُن کر بے اختیار مدینہ منورہ کی طرف دوڑ پڑے۔ اُن کی والدہ ماجدہ حیات تھیں، لیکن جذبۂ شوق نے اتنی بھی مہلت نہ دی کہ اُن سے جاکر اجازت لے لیں[۵۱]۔ اس طویل مسافت کو نہ معلوم کن کن مشکلوں سے طے کیا اور بالآخر شیخ یحییٰ مدنیؒ کے قدموں میں جا پہنچے۔

حضرت شیخ یحییٰ مدنیؒ حضرت شیخ محی الدین ابو یوسف یحییٰ الچشتیؒ شیخ کمال الدین علامہؒ کی اولاد سے تھے۔ اپنے زمانے کے مشاہیرِ صوفیہ میں ان کا شمار تھا۔ صاحب مراۃ احمدی نے لکھا ہے:

"ذاتِ مبارک ایشاں حجت بود بر مشائخ سلف بلکہ در متقدمین هم مثل ایشاں کم بودہ باشند[۵۲]"

۲۰ رمضان ۱۰۵۸ھ کو احمد آباد (گجرات) میں پیدا ہوئے تھے بیس سال کی عمر میں علومِ ظاہری وباطنی میں کمال حاصل کرلیا۔ پھر سجادۂ مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور تزکیۂ باطن میں مصروف رہنے لگے۔ شاہ وگدا سب ہی ان سے عقیدت رکھتے تھے اورنگ زیب جب گجرات کی صوبہ داری پر معمور تھا تو شیخ نظام کو ان کی خدمت میں بھیج کر ملاقات کی استدعا کی تھی۔ شیخ یحییٰ نے معذرت چاہی لیکن

---

۵۱ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۷۹

۵۲ خاتمہ مرات احمدی۔ ص ۷۹

پھر بھی اورنگ زیب اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نے پیش گوئی کی کہ تم تخت پر متمکن ہوگے اور تم سے "دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم" کو تقویت پہنچے گی۔[۵۱] لکھا ہے کہ شاہزادگی کے زمانے میں اورنگ زیب دو سو روپے سال اُن کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد ہر سال ایک ہزار روپیہ بھیجنے لگا۔ سماع پر جب مرزا باقر محتسب نے شیخ کے محلّے لئے تو اورنگ زیب نے معذرت کا خط لکھا اور محتسب کو تنبیہہ کی کہ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرے۔[۵۲] مکتوبات کلیمی میں ان کا ایک خط نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے اورنگ زیب کے نام لکھا تھا :۔

از جانب شیخ یحییٰ سلام برسد	شیخ یحییٰ کی جانب سے سلام پہنچے
از آنجا کہ سماع قوت صالحانست	سماع نیک لوگوں کی غذا ہے۔ اس
منع کردن راہم وجہے ندارد	سے روکنے کی کوئی معقول وجہ نہیں
والسلام "[۵۳]	والسلام۔

حضرت یحییٰ مدنیؒ ایک روحانی اشارے پر مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے وہیں ۲۸ صفر ۱۱۰۱ھ کو وصال فرمایا اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے مقبرے کے متصل سپردِ خاک کئے گئے۔ اُن کے تفصیلی حالات کے لئے معارج الولایت فی مدارج الہدایت کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ان کے ملفوظات مفتاح الکرامات کے نام سے محمد فاضل بن شیخ فیروز نے ترتیب دیے تھے۔

---

[۵۱] خاتمہ مرأت احمدی ص ۸۰

[۵۲] مرأت احمدی - ص ۸۱

[۵۳] مکتوبات کلیمی - ص ۸۲ مکتوب ۱۰۳

شاہ کلیم اللہ شاہجہان آبادیؒ
حضرت مدنیؒ کے قدموں پر

مدینہ منورہ پہنچ کر شاہ کلیم اللہ صاحبؒ اپنا زیادہ وقت شیخ مدنیؒ کی خدمت میں گزارنے لگے۔ ایک دن شیخ مدنیؒ اپنے کسی شاگرد کو شرح وقایہ پڑھا رہے تھے۔ شاہ کلیم اللہؒ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ شیخ تو علومِ ظاہری ہی کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ شیخ مدنیؒ نے اس خطرہ کو محسوس کر لیا اور وہ کتاب شاہ کلیم اللہؒ کے ہاتھ میں دے دی۔ شاہ صاحبؒ کا یہ حال ہو گیا کہ کتاب کی عبارت تک سمجھ میں نہ آئی۔ اپنے خیال سے توبہ کی۔ پھر شیخ کے تقدس اور علم و فضل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی اور اپنے حسب حال یہ قطعہ پڑھا ؎

آئی تو کہ از نام تو می بارد عشق
وز نامہ و پیغام تو می بارد عشق
عاشق شود آنکس کہ بکویت گزرد
گویا ز درو بامِ تو می بارد عشق[۵۱]

کچھ عرصہ شاہ کلیم اللہؒ حجاز میں مقیم رہے[۵۲] شیخ مدنیؒ نے اُن کو خرقہ خلافت سے نوازا اور ظاہری و باطنی نعمت سے سرفراز کیا[۵۳] شاہ صاحبؒ جب دہلی کو واپس ہونے لگے تو انھوں نے ایک کلاہ اور شجرہ دیا کہ دہلی میں شیخ یحییٰ کو دے دینا۔ شاہ صاحبؒ دہلی پہنچے تو سب سے پہلے اُن ہی سے ملاقات

۵۱ شجرۃ الانوار (قلمی)
۵۲ مآثر الکرام میں لکھا ہے "مدتہا درآں دیار فیض آثار بسر بُرد"، ص ۲۷
۵۳ تکملہ سیر الاولیا ص ۸۵

ہوئی اور آپس کی محبت اس قدر بڑھ گئی کہ ایک جان اور دو قالب ہو گئے، لکھا ہے:

"حضرت شیخ کلیم اللہ تصدق شیخ اچھا شدند، فیما بین ذوقہا وشوقہا وجدانہ بہم رسانیدند تا حینِ حیات رابطۂ یگانگت درمیان داشتند"۔ [۵۱]

درس و تدریس | شاہ کلیم اللہؒ نے دہلی واپس آکر بازار خانم میں اپنا مسکن بنایا اور سلسلۂ درس و تدریس شروع کر دیا۔ بازار خانم اس وقت دلی کا سب سے زیادہ بارونق بازار تھا۔ ایک طرف قلعہ کی دلکش عمارت تھی، دوسری طرف جامع مسجد کے فلک بوس مینار، درمیان میں شاہ صاحبؒ کا مدرسہ تھا۔ غالباً یہ جگہ ان کے خاندان کو شاہ جہاں کی طرف سے عطا کی گئی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ قلعہ اور جامع مسجد کے معماروں کے لئے اس سے زیادہ موزوں جگہ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ شجرۃ الانوار کے مصنف نے لکھا ہے:

"غرضکہ فانی فی اللہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی در شہر شاہجہان آباد آمدہ رونق افزا شدند، درآں زماں رونق و تیاری قلعہ تازگی داشت [۵۲] و جامع مسجد مسکن خود نمودہ و ازاکثر اوقات بعد از صلوٰۃ عصر زیر قلعہ برائے سیر دریا بنا بر تفرج طبع می رفت"۔

---

[۵۱] شجرۃ الانوار۔ شیخ اچھا کے مزار کے متعلق لکھا ہے:۔
"مزار حضرت شیخ اچھا درآں مجمع ہست کہ زیر روضۂ امیر خسرو واقع است، و مولوی غلام فرید برادر دینی احقر العباد و خلیفہ خاص حضرت مرشد من درآنجا مدفون اند"۔

[۵۲] ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں قلعہ کی بنیاد رکھی گئی ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں تیار ہوا
تاریخ ہوئی ؎ شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد

شاہ کلیم اللہ صاحب رح کی علمی شہرت بہت جلد اکناف ملک میں پھیل گئی اور دور دور سے طلبا تحصیل علم کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، شاہ صاحب رح کے مدرسہ کے متعلق تفصیلی معلومات دستیاب نہیں ہوتیں لیکن شجرۃ الانوار کے ایک بیان سے اس کی نوعیت پر کافی روشنی پڑتی ہے لکھا ہے:-

"بسیارے طلبائے علم آمدہ سکونت می نمودند وسبق کتب ہامی خواندند ونان وپارچہ نیز از سرکار می یافتند"	بہت سے طلبا، ان کی خدمت میں آکر رہتے اور علم حاصل کرتے تھے۔ ان کو کھانا اور کپڑا بھی سرکار سے ملتا تھا۔

خود شاہ صاحب رح کو حدیث کے درس میں خاص دلچسپی تھی۔ تذکروں میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں رح کا ایک واقعہ درج ہے کہ وہ شاہ صاحب رح سے ملنے کے لئے ایک مرتبہ اُن کے مدرسہ تشریف لے گئے تو دیکھا کہ شاہ صاحب رح صحیح بخاری کے درس میں مشغول ہیں[۵]

توکل کی زندگی | حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب رح کو توکل اور قناعت کی بے پناہ دولت ملی تھی۔ وہ عسرت اور تنگی میں دن گذارتے تھے لیکن کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا تو کیا معنی، امرا و سلاطین کی نذریں اور جاگیر نامے تک قبول نہ کرتے تھے تکملہ سیر الاولیار کا بیان ہے

شیخ کی ملکیت میں لے دے کے کل ایک حویلی تھی جس کا ماہوار کرایہ عہ آتا تھا۔ شیخ اس سے گذر اوقات کرتے تھے۔ ۸ ر ماہوار پر ایک مکان

---

۵ انوار العارفین۔ ص ۴۰۳

کرایے پرے رکھا تھا اور باقی دو روپے میں پورے گھر کا خرچ چلاتے تھے "۔[۵۱]

بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ قحط یا دیگر غیر معمولی حالات کے باعث اس مختصر سی آمدنی میں گذر اوقات نہ ہو سکی اور وہ قرض دار ہو گئے۔ ایک مکتوب میں شاہ نظام الدین اورنگ آبادی رح کو لکھتے ہیں:۔

"دریں سالہا کہ از تنگی باراں صورت قحط دریں ملک شدہ بود۔ وبانہ دہ نفر سواء مہمان گذران می شد، گاہے بیگاہے قرض داری می شدم "۔[۵۲]

اس زمانے میں جب کہ بارش کی کمی کے باعث ملک میں قحط کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور نو دس آدمی علاوہ مہمانوں کے کھانے والے تھے اکثر اوقات میں قرض دار ہو گیا۔

لیکن اس کے باوجود شاہ صاحب رح نے کسی بادشاہ سے کچھ قبول نہیں کیا، اُن کی خود داری کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی فرخ سیر نے بہت کوشش کی کہ شاہ صاحب کو خزانہ سے کچھ دے دیا جائے لیکن انھوں نے ہر بار انکار ہی کر دیا، تکملہ سیر الاولیاء میں لکھا ہے:۔

"بادشاہ فرخ سیر بارہا الحاح نمود کہ حضرت از بیت المال چیزے قبول فرمایند، ایشاں جواب داد ندکہ حاجت نیست، بازعرض کرد کہ حویلی از بہر نزول در معرض افتد۔ فرمودند بہ ایں نیز حاجت نیست[۵۳] بازعرض نمود اگر اجازت باشد بندہ در خدمت آمدہ سعادت دارین

---

۵۱ تکملہ سیر الاولیاء ص ۸۵

۵۲ مکتوب ۱۷ ص ۲۱

بقیہ نوٹ ۵۳ صفحہ ۳۸ پر

بہ قدم بوسی حاصل نمودہ باشد۔ فرمودند کہ تو ظل الٰہی ہستی در سایۂ
آں ذات ہمیشہ بہ دعا گوئی مشغول ام۔ بہ آں نیز حاجت نیست بلکہ
بندہ را تصدیع خواہد رسید"[۵۱]

جمعہ کی نماز آپ جامع مسجد میں پڑھتے تھے، وہاں بادشاہ بھی ہوتا تھا۔ لیکن
آپ کا اتنا رعب تھا کہ اُسے بغیر اجازت بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی[۵۲]

شاہ صاحب کا اخلاق | شاہ صاحب رح نہایت حلیم الطبع اور خوش مزاج انسان
تھے۔ جب کوئی شخص جس کو ان کی ناراضگی کا خیال ہوتا، معذرت کا خط لکھتا تو اس
انداز میں جواب دیتے کہ مومن کے اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتے ؎

نارسائی سے دم رُکے تو رُکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

وہ دشمنوں اور مخالفوں سے بھی کبھی ناراض نہ ہوتے تھے۔ جب کسی سے تکلیف

(بقیہ نوٹ سلسلہ ص ۲۸)

۵۰ بعد کو شاید شاہ صاحب رح نے ایک حویلی قبول فرمالی تھی۔ ایک مکتوب میں شاہ
نظام الدین صاحب کو لکھتے ہیں۔

"شاہ ضیاء الدین برائے فقیر از بادشاہ حویلی یک ہزار دو درعہ بازار خانم کہ
مشتمل است۔ بر یک ایوان و دو حجرہ و یک چاہ و یک چاچہ گرفتند۔ م ۱۸ ص ۶۴

فخر الطالبین میں لکھا ہے کہ آخر زمانے میں شاہ صاحب کی مالی حالت اچھی ہوگئی تھی اور فتوحات
کا سلسلہ ایسا شروع ہوا تھا کہ انھوں نے قریب ایک لاکھ روپیہ مالملاک وغیرہ ورثہ چھوڑا
تھا (ص ۱۴۲) ، لیکن اُن کے مکتوبات سے، اس کی تائید نہیں ہوتی۔ آخر زمانے کے
مکتوبات سے بھی عسرت اور تنگی کی حالت ظاہر ہوتی ہے۔

۵۱ و ۵۲ تکملہ سیر الاولیا ص ۸۵

پہنچتی تو زبان پر یہ اشعار جاری ہو جاتے ؎

ہر کہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ مارا یار نبود ایزد او را یار باد
ہر کہ خارے بر نہد در راہِ ما از دشمنی،
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد [۵۱]

اپنے مریدوں کو بھی یہی ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کی جفا و قفا برداشت کریں [۵۲] اور لب نہ ہلائیں، کہتے تھے کہ ہمارا کام دلوں کو ایک جگہ کرنا ہے۔ اس میں جتنی بھی مشکلات پیش آئیں، ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہیے [۵۳]

دکن میں ایک بار کچھ لوگوں نے ان کو بُرا بھلا کہا۔ شاہ نظام الدین رح نے اس کی اطلاع ان کو دی تو جواب میں ارشاد فرمایا :-

"ہر کہ مارا بد یاد می کند ما مستحق زیادہ ازانیم کہ او لطف کردہ کم دشنام می دہد، ما عفو کردیم شما ہم عفو کنید [۵۴]	کوئی شخص ہمیں برائی سے یاد کرتا ہے (تو ہمیں اس سے کوئی شکایت نہیں اس لئے کہ) ہم اس سے زیادہ برائی کے مستحق ہیں۔ اس نے لطف کیا اور ہمیں کم گالیاں دیں ہم نے اُسے معاف کر دیا، تم بھی اُسے معاف کر دو۔

---

[۵۱] مکتوبات کلیمی، م ۲۳ ص ۲۸، م ۹۸ ص ۷۷

[۵۲] مکتوبات م ۵ ص ۹

[۵۳] مکتوبات م ۲۳ ص ۲۷

[۵۴] مکتوبات ص ۳۶

تصانیف | شاہ کلیم اللہ صاحب رح نے تصانیف کا ایک بے بہا ذخیرہ چھوڑا ہے جس سے اُن کے تبحرِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مناقب فریدی میں اُن کی تصانیف کی تعداد ۲۰۳ بتائی گئی ہے[۵۱]۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف ہم تک پہنچی ہیں:

(۱) قرآن القرآن

(۲) عشرہ کاملہ

(۳) سواء السبیل

(۴) کشکول

(۵) مرقع

(۶) تسنیم

(۷) الہامات کلیمی

(۸) رسالہ تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیۃ

(۹) شرح القانون

شاہ صاحب کی ایک تصنیف رسالہ ردّ روافض کا بھی بعض کتابوں میں ذکر ہے، لیکن وہ دستیاب نہیں ہو سکی۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ علم منطق پر بھی ان کا ایک رسالہ تھا[۵۲] وہ بھی اب نایاب ہے۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب رح شعر بھی کہتے تھے اور ان کا کلام غدر کی تباہیوں کی نذر ہو گیا تھا[۵۳]

---

۵۱ مناقب فریدی ۔ ص ۳۴

۵۲ مناقب المحبوبین ص ۲۰۴ نیز مناقب فریدی ص ۳۴

۵۳ غالب کا خط حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام

اردوئے معلی حصہ اول ص ۱۸۲ - ۱۸۳

قرآن القرآن عربی زبان میں قرآن پاک کی نہایت اعلیٰ تفسیر ہے مناقب المحبوبین کے فاضل مصنف نے اس کو جلالین کے ہم پایہ بتایا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ شافعی مذہب کی ہے۔ یہ حنفی کی[۵۱] مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ شاہ فخر الدین صاحب رح کو اس کے اصلی نسخے کی تلاش تھی۔ ایک مرتبہ بازار تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک شخص کے پاس اس کا نسخہ دیکھا۔ اور بڑی قیمت دے کر خرید لیا[۵۲]

۱۹۲۰ء میں میرٹھ کے مطبع احباب سے منشی عرفان الحق نے اس کو اس طرح شائع کیا تھا کہ کلام پاک کے متن کے نیچے شاہ رفیع الدین رح کا ترجمہ تھا اور حاشیہ پر یہ تفسیر، مولانا محمد قاسم نانوتوی رح نے اس کی تاریخ کہی تھی ۔

کار فرمائے مطبع احباب	شیخ عرفان حق جوان دبیر
اور مختار ہاشمی مطبع	کون ہاشم علی با تدبیر
چھاپا ہو کر کے جمع دونوں نے	ایسا مصحف نہیں ہے جس کی نظیر
بیچ میں ترجمہ ہے اور اوپر	ایک تفسیر کی نئی تحریر
وہ تو فیض شہ رفیع الدین	بحر مواج فیض خیر کثیر
اور یہ فیض شہ کلیم اللہ	تھے طریقت میں جو کہ بدر منیر
چھپ چکا جبکہ سب یہ حرز جان	ہاتف غیب نے پے تشہیر
کرکے آواز کو بلند کہا	چھپا قرآن بمعنی و تفسیر

۱۲۹۰ھ [۵۳]

---

۵۱ مناقب المحبوبین ۔ ص ۴۶

۵۲ مناقب فخریہ ۔ ص ۶۹ قلمی

بقیہ نوٹ نمبر ۳ ص ۹۲ پر

عشرہ کاملہ، سواء السبیل، کشکول، مرقع، تسنیم اور الہامات کلیمی تصوف سے متعلق ہیں۔ ان میں تصوف کے مختلف علمی اور عملی پہلوؤں پر نہایت عالمانہ اور دلچسپ گفتگو کی گئی ہے۔ عشرہ کاملہ، کشکول اور مرقع شائع ہو چکے ہیں۔ سواء السبیل کا ایک عمدہ نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے[۵۱]

ان کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روحانی رہبر کی حیثیت سے شاہ صاحبؒ بڑی ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ اُنھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ مشائخ متقدمین کی کتابوں اور اپنے ذاتی تجربات سے انھوں نے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ ان اوراق میں موجود ہے۔ اُن کی تصانیف میں کشکول کلیمی کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب ۱۱۱۱ھ میں بعض احباب کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ خود فرماتے ہیں :-

امروز کہ غرہ ذی قعدہ ۱۱۱۱ھ ہزار و یک صد و یک است، بالتماس بعضے محبان ص ہی مقامات در یوزہ دریں کشکول فراہم آوردہ[۵۲]	آج کہ غرہ ذی قعدہ ۱۱۱۱ھ ہے۔ بعض خالص دوستوں کی درخواست سے کچھ لقمے مانگ کر اس کشکول میں جمع کئے ہیں۔

[۵۰] (بقیہ نوٹ ص ۲۹) مولانا محمد قاسمؒ ہی نے یہ تاریخ بھی نکالی تھی ؎

کیا خوب واہ کیا خوب

ختم المصاحف (۱۲۹۰)

کیا خوب چھاپا کیا خوب

۱۲۹۰

[۵۱] برہان ۳۴۵

[۵۲] کشکول کلیمی - ص ۳

اس وقت ان کی عمر ۹۴ سال تھی۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی نظر میں بڑی پختگی اور تجربہ میں بڑی وسعت پیدا ہو چکی تھی۔ صوفیۂ متاخرین نے بجا طور پر اس کو اپنا "دستور العمل" بنایا۔[۵۱] شاہ صاحب رح نے اس کی مخصوص افادیت کے متعلق لکھا ہے :-

"کشکولے کہ لقماتش لطیفۂ ربانیہ را طاقت بخشد .... و در پیکر اسلامِ مجازی روح ایمانِ حقیقی در دہد۔ و مردگان طبیعت را حیات جاودانی ارزانی دارد۔"[۵۲]	یہ ایک کشکول ہے جس کے لقمے لطیفۂ ربانی کو طاقت بخشتے ہیں ..... اور مجازی اسلام کے قالب میں حقیقی ایمان کی روح پھونک دیتے ہیں اور مردہ طبیعت کو جاودانی زندگی عطا کرتے ہیں۔

بعد کے مشایخ کا یہ دستور تھا کہ وہ خرقۂ خلافت کے ساتھ مرقع اور کشکول بھی دیتے تھے[۵۳] خود شاہ صاحب رح کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاص مریدین کو اصلاحِ نفس اور روحانی ترقی کے لئے کشکول کے مطالعہ کی ہدایت فرمایا کرتے تھے، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

"شما صحبت ہا دریافتہ اند دو کشکولے در مرقع آنجا موجود اند ہر طالب را موافق حوصلہ آں بہ نیابت ذکرے و شغلے بفرمایند۔"[۵۴]

---

۵۱ تکملہ سیر الاولیار ۔ ص ۸۱

۵۲ کشکول کلیمی ۔ ص ۲

۵۳ تکملہ سیر الاولیار ص ۸۱

۵۴ مکتوبات کلیمی ۔ م ۱۱۶ ص ۹۴

حافظ محمد علی صاحب خیر آبادی رح، کشکول کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ میاں اسلم صاحب رح نے کسی کو پڑھنے کے لئے دے دی، تو حافظ صاحب بہت ناراض ہوئے اور فرمایا "یہ کتابیں ایسی نہیں ہیں کہ نقلِ مجلس بنائی جائیں"۔[۵۱]

مرقع کی حیثیت کشکول کے ضمیمہ کی سی ہے۔ کشکول میں روحانی ترقی کے اعلیٰ مدارج اور دشوار گزار راہوں کا ذکر ہے، تو مرقع میں اس سفر کی تیاری کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے، اس کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ چنانچہ ان دونوں کتابوں نے مل کر ایک مکمل ضابطۂ روحانی کی شکل اختیار کرلی۔ اور صوفیۂ متاخرین نے اس کو وہی مرتبہ دیا جو صوفیۂ متقدمین نے فوائد الفواد اور کشف المحجوب کو دیا تھا۔ خواجہ گل محمد احمد پوری رح لکھتے ہیں:۔

ہر آن کو لقمہ زین کشکول ما خورد
قلندر گشت، گو از دو جہاں برد
ہر آن کو این مرقع کرد بر دوش
بجانان بیگماں گردد ہم آغوش[۵۲]

تسنیم کو بھی صوفیہ نے بہت پسند کیا۔ خواجہ محمد عاقل نہایت ہی والہانہ انداز میں اس کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے ایک مرید مولانا عبداللہ نے جو بڑے عالم و فاضل تھے۔ اس کی شرح تسنیم کے نام سے لکھی تھی[۵۳]

۵۱ مناقب حافظیہ۔ ص ۱۵۷

۵۲ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۸۱

۵۳ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۵۶

"رسالہ شرح تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیۃ" علم ہیئت سے متعلق ہے۔ اس کا ایک نادر نسخہ نذیریہ پبلک لائبریری دہلی میں موجود ہے[۵۱]۔ شرح قانون کا واحد نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے[۵۲]۔

مکتوبات | ان تصانیف کے علاوہ شاہ صاحب رحؒ نے اپنے مکتوبات بھی چھوڑے ہیں، جن کا مجموعہ مکتوبات کلیمی کے نام سے شائع ہوا ہے۔ شاہ صاحب کی دوسری تصانیف سے اگر ان کی علمیت، تبحر، اور روحانی افکار و خیالات کا پتہ چلتا ہے، تو ان مکتوبات سے اُن کی تبلیغی سرگرمیوں کا پورا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا ہے۔ اعلاءِ کلمۃ الحق کے لئے اُن کی پُرخلوص جدوجہد، چشتیہ سلسلہ کی ترقی کے لئے مسلسل کوشش، اور لشکریوں اور عوام میں روحانی تعلیم و تربیت کے لئے ان کی سعیِ بلیغ کا علم ان ہی مکتوبات سے ہوتا ہے۔ اُن کی دیگر تصانیف اگر ان کی "علمیت" کی شاہد ہیں تو یہ مکتوبات ان کی "عملی سرگرمیوں" کے آئینہ دار ہیں ان دونوں کے مطالعہ سے شاہ صاحب رحؒ کی زندگی کے علمی اور عملی دونوں پہلو روشن ہو جاتے ہیں اور اُن کی شخصیت پوری طرح سے ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

تعداد میں یہ مکتوبات ۱۳۲ ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ خطوط شیخ نظام الدین اورنگ آبادی رحؒ کو دکن بھیجے گئے ہیں۔ باقی خطوط مولانا محمد، دیارام، عبدالرشید وغیرہ کے نام ہیں۔ شیخ نظام الدین صاحب رحؒ کے نام جو مکتوبات ہیں وہ نسبتاً زیادہ صاف اور مفصل ہیں اور حقیقت میں سارے

---

۵۱ فہرست کتب قلمی نذیریہ پبلک لائبریری، دہلی۔ مرتبہ محمد مہدی جعفر ۳۳ ۵۷ ۸ ۸۴
۵۲ فہرست کتب خانہ رامپور۔ ۵۸۶ (طب)

مجموعے کی جان ہیں۔

شاہ صاحب کی تبلیغی جدوجہد شاہ کلیم اللہ نے اسلامی ہند کی تاریخ کے ایک نہایت ہی نازک اور اہم دور میں احیارِ ملت کے لئے جدوجہد کی تھی۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکومت کا آخری زمانہ تھا۔ ہندوستان کی سیاست کا مرکزِ ثقل شمال سے جنوب کی طرف منتقل ہو چکا تھا، بادشاہ، شاہی خاندان فوج کا بیشتر حصہ، سب دکن میں پہنچ چکا تھا۔ شمالی ہندوستان کی اہمیت نسبتاً کم ہو گئی تھی۔ دہلی، اگرہ، لاہور سب اپنی عظمتِ دیرینہ کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ محلات میں حسرت ناک خاموشی طاری تھی۔ سارا سازو سامان تالوں میں بند پڑا تھا۔ اسلامی ہند کی تاریخ کا یہ عبوری دور تھا۔ شاہ صاحب رحؒ نے وقت کی آواز کو پہچانا اور اپنے عزیز ترین مرید شیخ نظام الدین رحؒ کو تبلیغ و اصلاح کے کام کے لئے دکن روانہ فرمادیا۔ خود ایک مکتوب میں شیخ نظام الدین رحؒ کو لکھتے ہیں :-

"شمارا اللہ تعالےٰ صاحبِ ولایت دکن ساختہ است۔ این کار را تمام نمائید، قبل ازیں می نوشتم کہ بہ لشکر بروید، اکنوں این امر است ہر جا کہ باشید درا علائے کلمۃ الحق باشید و جان و مال خود صرفِ این کار کنید"[1]

تم کو اللہ تعالےٰ نے دکن کی ولایت عطا فرمائی ہے۔ تم یہ کام پورے طور پر انجام دو، میں نے اس سے پہلے تم کو لکھا تھا کہ لشکر میں جاؤ لیکن اب یہ حکم ہے کہ جہاں کہیں ہو اعلائے کلمۃ الحق میں مصروف رہو اور اپنے جان و مال کو اسی میں ہی صرف کر دو۔

---

[1] مکتوباتِ کلیمی۔ م ۲۱ ص ۲۶

شاہ صاحب کے مکتوبات میں ایک بے قرار اور بے چین قلب کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ ہر خط میں وہ اپنے مرید کو اعلائے کلمۃ الحق کی ہدایت کرتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں :۔

(۱) "جان و مال خود را صرفِ این کار کنید[۵۱]	اپنے جان و مال کو اسی کام میں صرف کردو۔
(۲) فیض دینی و دنیوی بہ عالم رسانند وہمہ حلاوت و عیشِ خود فدائے آں بندگان باید کرد[۵۲]	دینی اور دنیوی فیض دنیا کو پہنچاؤ۔ اپنا عیش و آرام اور راحت انسانوں پر فدا کردو

وہ اسلام کو ہندوستان میں انتہائی ترقی پذیر دیکھنا چاہتے تھے اور ان کا احساسِ ملی اسلام کا پیغام ہر کان تک پہنچانے کے لئے مضطرب تھا چنانچہ بار بار مریدوں سے کہتے ہیں :۔

" درآں کوشید کہ صورتِ اسلام وسیع گردد و ذاکر این کثیر[۵۳]

وہ خطوط میں اور باتیں بھی لکھتے ہیں لیکن جس کو بار بار دہراتے ہیں ، وہ یہ ہی ہے

(۱) "بہر حال در اعلائے کلمۃ الحق کوشید و از مشرق تا مغرب ہمہ حقیقی پر کنید"[۵۴]

---

۵۱ مکتوبات۔م ۲۱ ص ۲۶

۵۲ مکتوبات م ۷۵ ص ۶۰

۵۳ مکتوبات م ۷۶ ص ۶۰

۵۴ مکتوبات م ۸۰ ص ۶۲

(۲) "متوجہ اعلائے کلمۃ الحق باشند واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون" [۵۱]

اُن کے قلبِ مضطر کی آواز صرف ایک جملہ میں پوشیدہ تھی "از مشرق تا مغرب ہمہ اسلام حقیقی برکنید" اسی دُھن میں اُن کے شب و روز گزرتے تھے وہ دہلی میں تھے لیکن دکن کا نظامِ تبلیغ و اصلاح اُن کی ہدایتوں کے ماتحت کام کر رہا تھا۔ وہ ناسازگار حالات کو دیکھتے تھے، لیکن اللہ پر ان کا بھروسہ تھا اور لَا تَقْنَطُوا پر اُن کا ایمان۔

لوگوں کو مادیت پسند دیکھ کر ان کا قلب پریشان ہونے لگتا تھا۔ اور وہ گھبرا گھبرا کر کہتے تھے :۔

بر دلِ بندگانِ خدا محبتِ دُنیا سرد گرا دنند [۵۲]	بندگانِ خدا کے دل سے دنیا کی محبت ختم کر دینا چاہیے۔

جب عیش پرستی اور نفس پروری میں لوگوں کو گرفتار دیکھتے ہیں تو سمجھاتے ہیں :۔

اے دوست دنیا جائے نفس پروری و تن آسانی نیست [۵۳]	اے دوست! دنیا نفس پروری اور تن آسانی کی جگہ نہیں۔

تبلیغِ دین و دعوتِ حق کے ثواب اور فضیلت کو ان پُر زور الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :۔

---

[۵۱] مکتوبات۔ م ۸۰ ص ۶۲
[۵۲] م ۱۳ ص ۱۹
[۵۳] م ۷۴ ص ۵۹

"واقرب عند اللہ و رسولہ آں کے روز رستخیز است کہ
در اقتضائے نور باطن ایمان ساعی است۔"[۵۱]

جذبۂ اعلائے کلمۃ الحق کا اتنا غلبہ ہے کہ شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کو اپنے ایک مُرید کے منصبِ شاہی ملنے کی اطلاع دیتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ اپنے اصلی نصب العین کی طرف اس طرح متوجہ کرتے ہیں :۔

"اے برادر منصب ما دشما فقر است، کوشش کنید در
اعلائے کلمۃ اللہ۔"[۵۲]

ان کی تمنا تھی کہ ان کے تمام مرید اشاعتِ اسلام اور اعلار کلمۃ اللہ کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ اور وہ خلافت اسی مقصد کے پیشِ نظر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ نظام الدین صاحبؒ نے ایک شخص کے لئے خلافت کی سفارش کی تو جواب میں ارشاد ہوا :۔

"جب تک اعلار کلمۃ اللہ کے لئے کمرِ ہمت نہ باندھی جائے
خلافت سے کیا فائدہ"[۵۳]

بار بار اُن کی زبان سے یہ ہی نکلتا ہے کہ تبلیغ اسلام اور احیائے دین کی کوشش کرو۔ یہ ہی مسلک ہمارے بزرگوں کا رہا ہے۔ اس میں کوتاہی اچھی نہیں۔ اپنے مرید محمد علی کو لکھتے ہیں :۔

" ہمیشہ در اعلائے کلمۃ اللہ کہ پیران من وعن رسیدہ

---

۵۱ مکتوبات کلیمی۔ م ۷۲ ص ۵۹

۵۲ مکتوبات م ۵۴ ص ۹۴

۵۳ مکتوبات م ۳۹ ص ۳۹

کوشش نمایند" ۵۱

احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی فضیلت کو وہ یہ کہہ کر ذہن نشین کراتے ہیں کہ یہ موجبِ رضائے الٰہی ہے اور انبیا کا خصوصی کام ہے :۔

"دریں باب جہاد نمایند و ایں کار سہل نہ انگارند، و منتشراً در معمورۂ عالم سازند کہ رضائے الٰہی دریں است و اصلاح مفاسد فرزندانِ آدم نمایند کہ انبیاء مبعوث برائے ہمیں کار بودہ اند"

ایک مکتوب میں اس کو "کارِ بزرگ" کہتے ہیں :۔

"شمارا کارِ بزرگ ایصالِ فیض و اعلائے کلمۃ اللہ فرمودہ ام ہم دریں کار گرم آمدید" ۵۲

شاہ صاحب رح کے اس اصرارِ پیہم اور کوششِ مسلسل نے مریدوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ شیخ نظام الدین اورنگ آبادی رح نے اپنے پیر و مرشد کی ہدایات پر عمل کیا اور بہت جلد کامیابی حاصل کی۔ جب شیخ نظام الدین صاحب کا ایک مرید نور محمد ان کا خطلے کر دہلی آیا تو شاہ کلیم اللہ رح نے سب کیفیت دریافت فرمائی۔ شیخ نظام الدین رح کی تبلیغی مساعی کو بنظرِ استحسان دیکھا اور اس مضمون کا ایک خط بھیجا :۔

"مطالعہ فرمایند امروز کہ ۷ محرم الحرام ۱۱۳۳ھ مرقوم می گردد کہ میاں نور محمد خادم شما کہ از اولاد حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ...... کتابت شما آوردہ اند ...... الحمد للہ

---

۵۱ م ۱۱۵ ص ۸۸

۵۲ م ۲۸ ص ۳۱

والمنۃ درا علائے کلمۃ اللہ سعی موفور مبذول است ۔ مرقوم بود کہ در چنین وضع اعلام بیشتر است ۔ بہ نسبت آں وضع اے برادر ۔ بہر حال مقصود ایصال فیض فقر محمدی است بعالمیاں بہر وضع کہ بیشتر ایں کار سرانجام یابد باید کرد "۵۱

شیخ نظام الدین صاحب رح کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ہندو گرویدۂ اسلام ہو گئے ۔ بعض اپنے رشتہ داروں کے ڈر سے مسلمان ہونے کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن دل سے مسلمان ہو چکے تھے ۔ شاہ کلیم اللہ صاحب رح ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"دیگر مرقوم بود بھیہ دیا رام وہند وہائے دیگر بسیار در ربقۂ اسلام در آمدہ اند ، اما با مردم قبیلہ پوشیدہ می مانند " ۵۲

ساتھ ہی ساتھ اس چیز کو بھی پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کے بعد اپنے مسلمان ہونے کو مخفی رکھے ۔ مبادا بعد موت اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے :-

"برادر من اہتمام نمایند کہ آہستہ آہستہ ایں امر جلیل از بطون بظہور انجامد کہ موت در عقب است مبادا احکام اسلام بعد از رحلت بجا نیارند و مسلمانان حقیقت را بسوزانند ، و دیا رام اگر خطے می نویسد خطے نوشتہ خواہد شد " ۵۳

---

۵۱ مکتوبات کلیمی ۔ م ۴۸ ۔ ص ۷۴
۵۲ مکتوبات م ۲۱ ۔ ص ۲۵
۵۳ مکتوبات م ۱۰ ۔ ص ۱۸

اس مکتوب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب رح کی تبلیغی مساعی کس حد تک دکن میں کامیاب ہوئی تھیں۔ اس خط میں دیا رام کا ذکر ہے۔ یہ شخص بھی اُن لوگوں میں سے تھا جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا لیکن قبیلہ کے ڈر سے اُس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے خط سے پتہ چلتا ہے کہ دیارام کا اسلامی نام شاہ صاحب رح نے فیض اللہ رکھا تھا۔

"بہ دیارام یعنی شیخ فیض اللہ اگر کتابت می نویسد جواب می نویسیم" [۵۱]

معلوم ہوتا ہے کہ دیارام نے اس خوف سے کہ کہیں اس کے مسلمان ہونے کا اظہار نہ ہوجائے، خطوط بہت کم لکھے۔ شاہ کلیم اللہ رح ایک خط کے جواب میں اُنھیں لکھتے ہیں :-

"محبت اطوار خواجہ دیارام از یادِ حق بہ آرام تمام باشند۔ قبل ازیں نمیقۂ ارسال ایں طرف نمودہ بودند۔ یکے از دوستان شاہ نظام الحق والدین رسایند وازیں طرف مکرر جواب رفتہ۔ قاصدانِ نامہ بررا چہ تواں کرد۔" [۵۲]

دیارام کو درود کی مواظبت اور چند کتبِ سلوک کے مطالعہ کی تاکید شیخ نظام الدین صاحب رح کے ذریعے اس طرح فرماتے ہیں :-

"درجواب دیارام نوشتہ آمد کہ مواظبت بہ درود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسیار نمایند کہ سرمایۂ ہر سعادت این است دیگر

---

[۵۱] مکتوبات - م ۴۲ ص ۴۱

[۵۲] مکتوبات - م ۱۰۸ ص ۸۴

مطالعۂ کتب، سلوک و تواریخ چوں نفحات و تذکرۃ الاولیا، رسائل حقائق چوں لمعات و شرح لمعات و لوائح و شرح آں در مطالعہ داشتہ باشند، اما احدے از بیگانگاں مطلع نہ شود"۔[۵۱]

شاہ صاحبؒ کا نظام تعلیم و تربیت | شاہ کلیم اللہ صاحبؒ نے اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کے لئے نہایت مکمل نظام قائم کیا تھا۔ انھوں نے اپنے اُن تمام مریدوں کی جن کو تبلیغی و اصلاحی کام پر مامور کیا تھا، نہایت سختی سے نگرانی کی، وہ اُن سے باربار معلوم کرتے رہتے تھے۔

"کجا تا بہ کجا ترقی کردہ اند"۔[۵۲]

وہ خود دہلی میں رہتے تھے لیکن دکن کا نظامِ تعلیم و تربیت ان کی زیرِ ہدایت کام کر رہا تھا، معمولی معمولی معاملات پر وہ مرکز سے ہدایات روانہ کرتے تھے۔ مریدوں کا یہ حال تھا کہ بغیر ان کی اجازت کوئی قدم نہ اُٹھاتے تھے۔ ایک خط میں خود نظام الدین صاحبؒ کو لکھتے ہیں :-

رحمت خدائے تعالےٰ بر شما	اللہ کی تم پر رحمت ہو کہ بے اجازت
باد کہ بے اجازت قدم برندارند	قدم تک نہیں اُٹھاتے جس نے بھی
کسیکہ بدولتے رسید بہیں	(عزت و عظمت اور روحانی سعادت)
ادب رسید"[۵۳]	حاصل کی، اسی ادب سے حاصل کی۔

خطوط کے معاملہ میں وہ نہایت باقاعدگی برتتے تھے۔ خط میں دیر ہو جاتی تو شاق گذرتا۔ انتظار میں رہتے اور لکھتے۔

---

۵۱ مکتوبات۔م ۶ ۔ ص ۱۲-۱۱
۵۲ مکتوبات م ۳۳ ص ۳۵ ۵۳ مکتوبات م ۵ ص ۹

(۱) "دَر ایصال نامجات تسامح نورزند۔ المکتوب نصف الملاقات است" [۵۱]	خطوں کے بھیجنے میں دیر نہ کریں۔ خط نصف ملاقات ہے۔
(۲) عذر نوشتن کتابت از طرفِ ما اگر باشد مقبول است و مسموع و از طرف شما نامقبول و نامسموع" [۵۲]	خط (میں تاخیر) کا عذر اگر ہماری طرف سے ہو تو قبول کیا جاسکتا ہے اور سُنا جاسکتا ہے لیکن اگر تمھاری طرف سے ہو تو نامقبول و نامسموع ہے۔
(۳) "مکتوبِ محبت اسلوب مدتہا است کہ نرسید، چشم نگراں است [۵۳]	مکتوب محبت اسلوب مدت سے نہیں آیا، آنکھیں منتظر ہیں۔

وہ چاہتے تھے کہ مرید جو خط بھیجیں وہ محض رسمی نہ ہوں۔ بلکہ اس میں اپنے پورے حالات و واردات اور تقسیمِ اوقات کی بابت لکھیں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کن کن مشاغل میں اُن کا وقت صرف ہوتا ہے اور اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں وہ کس حد تک سرگرم ہیں۔ شاہ صاحب رح کے نزدیک اُن کے اصلاحی نظام کی کامیابی کا انحصار اس پر تھا کہ مریدوں کی پوری نگرانی کی جائے۔ اور ان کی خلوت و جلوت کا پورا پروگرام مرتب کیا جائے۔ وہ ضبطِ اوقات اور پابندیِ اصول کا درس دیتے رہتے تھے۔ اکثر مکتوبات میں اپنے مریدوں سے نظامِ اوقات دریافت فرماتے ہیں، اور معلوم ہونے پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔

---

۵۱ مکتوبات۔ م ۲۳۔ ص ۲۸

۵۲ مکتوبات م ۳۳ ص ۳۵

۵۳ مکتوبات م ۶۴ ص ۵۴

"تقسیم اوقات و توزیعِ مراتب خلوت و جلوت ہمہ معلوم شد"[۵]

اگر کوئی خلیفہ اپنے پروگرام سے مطلع نہ کرتا تو شاہ صاحب خود دریافت فرماتے ۔

"اما خوب معلوم نشد کہ اوقاتِ گرامی بکدام توزیع مصروف است آیا بہنگ طالب علماں یا درویشاں یا نہ ایشاں و نہ ایشاں "

م ۱۵ ص ۲۰

پابندیٔ اوقات نہ کرنے والے کے متعلق صاف صاف لکھ دیتے ہیں ۔

"ضبطِ اوقات آنکہ ندارد خسر الدنیا والاخرہ است "

م ۲۲ ص ۲۶

سرگرمی اور مشغولیت کی برابر تاکید رہتی ہے ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ۔

"شما درکار خود سرگرم تر باشید	تم اپنے کام میں اور زیادہ سرگرم ہوجاؤ
کہ ہیچ کس بر شما شائق نتواند بود	یہاں تک کہ جو تمہارے پاس پہنچے
مگر آنکہ کار شما بکند "	تمہارا کام کرنے لگے ۔

م ۴۴ ص ۴۵

بعض اوقات خود بھی شاہ صاحب رح اپنے مریدوں کے لئے نظامِ اوقات متعین فرماتے تھے ۔ ایک خط میں فجر کی نماز کے بعد سے لے کر رات تک کا انفرادی اور نفلی پروگرام بتانے کے بعد اجتماعی پروگرام کی طرف اس طرح متوجہ کرتے ہیں ۔

"........ شریعت بما احکام باید نمود .... یارانِ اہل علم را درس تفسیر و حدیث و عبادات و فقہ درمیان ظہر و عصر و بعد از صبح بگویند و اہل شوق کہ اندکے بعلم آشنا باشد درس لمعات و لوائح و امثال آں بہر حال

---

[۵] مکتوبات ۔ م ۳۴ ص ۱۷ نیز م ۶ ص ۱۱

مراتبِ تمکین بہ از مراتبِ تلوین است ۔"

م ۹۹ ص ۷۹ - ۷۸

ذاتی مطالعہ کے لئے حدیث وفقہ، اخلاق وتصوف، سیر وتاریخ کی کتابوں کی ہدایت فرماتے ہیں ۔

"بمطالعہ کتب ..... حدیث وفقہ وسلوک چوں احیا وکیمیا وامثال ذلک چوں تواریخ مشائخِ پیشیں بہتر است ۔" [۵۱]	حدیث وفقہ کی کتابیں اور سلوک کی کتابیں مثلاً احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت اور مشائخ متقدمین کے تذکرے مطالعہ کرنے بہتر ہیں ۔

ایک اور خط میں تذکرۃ الاولیاء شیخ فرید الدین عطار رح، نفحات الانس مولانا جامی رح منازل السائرین اور رشحات کے مطالعہ کی خاص طور سے تلقین کی ہے ۔ [۵۲] شاہ صاحب اپنے مریدوں کے تعلقات کی نگرانی بھی فرماتے تھے ۔ اگر بربنائے بشریت کوئی جھگڑا یا بدمزگی آپس میں پیدا ہو جاتی تو اس کو جلد سے جلد رفع کرنے کی کوشش کرتے اور عفو ودرگذر کی ہدایت فرماتے تھے تاکہ نظام میں خلل واقع نہ ہونے پائے ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

"حقائق میاں اسد اللہ ومیاں ضیاء اللہ بہ تفصیل معلوم شد، شما ہرگز مخالفت باہر دو عزیز نخواہید کرد وشما متوجہ کار خود باشید ۔"	میاں اسد اللہ اور میاں ضیاء اللہ کے حالات تفصیل سے معلوم ہوئے تم کو ہرگز ان دونوں سے مخالفت نہ کرنی چاہیئے، بلکہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے ۔

م ۷۰ ص ۷۴ - ۷۳

---

۵۱ مکتوبات کلیمی ۔ ص ۱۴۱

۵۲ مکتوبات کلیمی ۔ ص ۷۹

پھر ایک خط میں نصیحت کرتے ہیں :۔

"میاں اسداللہ و میاں ضیاء الدین برادران شما اند باید کہ بایک دیگر فانی باشند و اگر از یکے خلاف مرضی امرے شد دیگرے از کرم عفو نماید و بہ محبت زندگانی کنند"	میاں اسداللہ اور میاں ضیاءالدین تمہارے بھائی ہیں۔ چاہئے کہ شیر و شکر ہو کر رہو۔ اگر کسی سے دوسرے کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو دوسرا معاف کردے اور محبت سے زندگی بسر کی جائے۔
م ۲۱ ص ۲۶ - ۲۵	

شاہ صاحبؒ نے ایک مکتوب میں جس کو خود وہ "دستورالعمل" قرار دیتے ہیں، اپنے تعلیمی اصول و ضوابط کا پورا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"اے برادر! ایں نامہ مرا دستورالعمل خود شناسید و در حکم آں احتیاط نمائید کہ فرد گذاشت را در آں مدخل نباشد و حد اوسط از دل بروں نہ رود" م ۹۶ صفحہ ۷۳

اس کے بعد حسب ذیل اصول بیان فرماتے ہیں :۔

(۱) ایصال[1] خیر کو مقصود قرار دیا جائے۔

(۲) ایصال خیر میں اخلاص اور تصحیح نیت سے کام لیا جائے (ص ۷۳)

(۳) ہجوم خلائق مستوجب شکر الٰہی ہے (اس سے گریز نہ کیا جائے۔) (ص ۷۴)

(۴) اگر فتوحات ملیں تو آپس میں تقسیم کر دیا جائے ورنہ اس دن کو

---

[1] "خیر عبارت از فنار ماسویت از جمیع المسالک الی البقا بحق تعالی و قیام المسالک فی جمیع محبۃ اللہ این معنی باید کہ ہمیشہ در نظر باشد و شرح ایں را دریں نامہ نتوانم" م ۹۶ ص ۷۳

غنیمت سمجھا جائے جس دن فتوحات میسر نہ آئیں کہ

"درفقر وفاقہ تاثیرے عظیم است" (ص ۴۷)

(۵) مسئلہ وحدت الوجود کو ہرکس و ناکس کے سامنے نہ چھیڑا جائے بلکہ استعداد و اہلیت دیکھنے کے بعد حسب موقع اس پر بحث کی جائے

"مسئلہ وحدت وجود را شائع پیش ہر آشنا و بیگانہ نخواہید بر زبان آورد" (ص ۴۷)

(۶) ہندو اور مسلمان دونوں سے تعلقات رکھے جائیں تاکہ غیر مسلم تعلیمات اسلام سے متاثر ہوں اور

"ذکر بخاصیت خود او را بطریقۂ اسلام خواہد کشید"

(ص ۴۷)

(۷) مریدوں میں ادب اور احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ چونکہ

"صحبت انبیاء باصحاب چناں بود" (ص ۴۷)

(۸) اپنے مریدین سے "احیائے سنت" اور اماتتِ بدعت کے لئے پوری پوری کوششیں کرائی جائیں

"ہرکہ از یاراں خود اذن دہند مبالغہ در احیائے سنت و اماتت بدعت خواہد بود" (ص ۷۵)

شاہ صاحب رحمہ نے اپنے نظام تعلیم و تربیت کے کچھ اہم اصول اپنی کتابوں میں بھی بیان کئے ہیں۔ مثلاً اذکار کی تعلیم کے متعلق ہدایت کرتے ہیں

"اگر مرید عجمی باشد بہر زبان کہ داشتہ باشد تلقین فرمایند" [۵۸]	اگر مرید عجمی ہو تو اسی کی زبان میں ان کے پڑھنے کی تلقین فرمائیں۔

---

۵۸ کشکول کلیمی

اشاعت سلسلہ کے لئے ہدایات | حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب رح اپنے سلسلہ کی اشاعت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ جگہ جگہ مریدوں کو حکم ہوتا ہے

(۱) "سعی در شیوع سلسلہ نمایند"

(م ۱۳ ص ۱۹)

(۲) "جہد بلیغ نمائید کہ مردم در سلک شما داخل شوند و بمرتبہ فقر رسند"

(م ۷/۸ ص ۶۶)

ایک مکتوب میں ارشاد ہوتا ہے :-

"شما در اصلاح دل محجوبان بکوشید کہ بعز وصال و قرب رسند و ریاضت و مجاہدہ و عشق و بے خودی مریدان و طالبان را تربیت کنید کہ تا قیام قیامت برائے ما و شما فواتح بہم و متصل برسد

م ۱۱ ص ۱۷

نیز م ۴ ص ۹

ایک مرتبہ شیخ نظام الدین نے اپنے پیر و مرشد سے فتوحات قبول کرنے کے متعلق دریافت کیا۔ شیخ نے اشاعتِ سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دیا کہ اگر فتوحات سے کام میں رکاوٹ واقع ہوتی ہو تو قبول نہ کرنا بہتر ہے، ورنہ قبول کر لینی چاہیے :-

"اے درویش خدائے تعالیٰ شما را عقلِ معاش و عقلِ معاد ہر دو دادہ است۔ آں کنید کہ دراں اجرائے سلسلہ باشد ما گرفتن و نا گرفتن نمی دانیم۔ اگر رونق سلسلہ از عدم قبول است عدم قبول بہتر ز قبول۔

(م ۱۳ ص ۱۹)

ساتھ ہی ساتھ صوفیۂ متقدمین کے فتوحات قبول کرنے کو نیک نیتی پر محمول کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"درویشانِ ماضی کہ قبول بعضے فتوحات کردہ اند اغلب کہ برائے استمالتِ خاطر معتقدان کردہ اند والا بضرورت خود کم کسے قبول کردہ باشد"
م ۱۴ ص ۱۹

مرید کی اشاعتِ سلسلہ کی کوششوں کا جب علم ہوتا ہے تو اظہارِ مسرت کرتے ہیں۔ دعائیں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ارواحِ مشائخ اس کام سے خوش ہوتی ہیں۔ اگر شیخ کی اولاد کو خزانہ بھی دے دیا جائے تو شیخ کی روح اس قدر خوش نہیں ہوتی جتنی احیاءِ سلسلہ کی کوششوں سے ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"پس رحمت خدائے تعالے بر شما باد کہ ایں سلسلہ را جاری کردید۔ شکر اللہ سعیکم۔ وایں ہمہ افتادگان حضیض غفلت را با درج حضور رسانیدٔ و ارواح مشائخ با خود خوشنود کردید۔ بالفرض اگر کسے گنجے باولاد شیخ بخشد آں قدر رضامندی جنابِ ایشاں در آں نباشد کہ در احیاءِ سلسلہ ایشاں باشد"
م ۴۴ ص ۵۴

نظامِ خلافت مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ کلیم اللہ صاحبؒ نے خلافت کا نہایت مکمل اور مضبوط نظام قائم کیا تھا۔ ہر کس و ناکس کو خلافت نہیں دی جاتی تھی، نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں یہ کام پہنچنے کی صورت میں گمراہی اور ضلالت پھیل جانے کا اندیشہ تھا۔ جس کو وہ جا بجا ظاہر بھی کرتے ہیں۔ خلافت سے متعلق ان کے اصول یہ تھے:۔

(۱) خلافت دینے کا مقصد اشاعت اسلام کے لئے جدوجہد ہے۔
م ۳۹ ص ۳۹

(۲) خلافت جس کو دی جائے اس کے تفصیلی حالات مرکز کو لکھے جائیں تاکہ اسا

کی صلاحیت اور اہلیت کا اندازہ ہو سکے [51] م ۱۸ ص ۲۲

(۳) صرف اہلِ علم کو خلافت دی جائے [52] اس لئے کہ

"در صحبت او ضلالت رواج نخواہد گرفت" م ۷۴ ص ۵۴

(۴) خلافت کی دو قسمیں کی جائیں۔ خلافت ربانی اور خلافت سلوک

"اول ہر کہ حیثیت فقر داشتہ باشد باید فرمود من غیر امتیاز میان یکون عالما او جاہلاً۔ اما قسم ثانی کہ مثال بنویسند و برو بکنند این قسم مخصوصاً بہ اہل علم دارند" م ۹۶ ص ۷۴

(۵) بیعت کرنے کے بعد فوراً اجازت بیعت نہ دی جائے

م ۹۶ ص ۷۴

عورتوں کی بیعت کے متعلق شاہ صاحب کی ہدایات	شیخ نظام الدین صاحب رح کو دکن

---

[51] شیخ نظام الدین اورنگ آبادی رح نے ایک شخص محمد مرزا یار بیگ کو خلافت دی۔ شاہ صاحب رح نے خط لکھا:۔

"محمد مرزا یار بیگ را خلافت دادید۔ خوب کردید۔ بیت

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس

کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس" م ۶ ص ۱۲

ان کی اہلیت کے متعلق اس طرح رائے قائم کی تھی۔

"از رقعہ ایشاں کہ بفقیر نوشتہ بودند، معنی عشق می تراوید"

م ۶ ص ۱۲

[52] مکتوبات میں جگہ جگہ اس کا اصرار ہے۔ م ۴۴ ص ۳۴، م ۴۹ ص ۵۶ م ۵۲ ص ۵۸

م ۹۴ ص ۷۴

میں جو صورتِ حال پیش آتی تھی اس کے متعلق وہ اپنے پیر و مرشد سے ہدایت و مشورہ طلب کرتے تھے، چنانچہ جب عورتوں کو سلسلہ میں داخل کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا تو شیخ نظام الدین رح نے اپنے شیخ کو لکھا۔ جواب میں حکم ہوا کہ بیعت کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کی خلوت سے بچا جائے اور براہِ راست ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت نہ کیا جائے۔ چونکہ مسِ اجنبیہ حرام ہے :-

"برادرمن زناں را بیعت کنید اما بازناں جواناں خلوتہائے طویلہ کہ موجب فتنہ مردم بشود نکنند، و در صحبت اولی وقت بیعت دامنے بردست پیچیدہ دست بردست او دارند کہ مس اجنبیہ حرام است"

م ۲۱ ص ۲۵

اس مشروط اجازت نامہ کی رو سے شاہ صاحب رح نے عورتوں کو بھی اصلاحِ باطن سے محروم نہ رکھا۔ لیکن شیخ نظام الدین نے اس کے بعد بھی عورتوں کو داخل سلسلہ کرنے میں تامل کیا اس پر آپ نے لکھا :-

"شما در بیعت کردن باعورات چرا ابا می ورزید، اگر جوان اند و اگر پیر، اگر حسین اند اگر قبیح، ہمارا بجائے محرمات پنداشتہ کلمۂ حق بگوش ایشاں باید رسانید" م ۳۵ ص ۳۷۔	تم نے عورتوں کو بیعت کرنے میں کیوں تامل کیا۔ چاہے جوان ہوں یا بوڑھی، خوب صورت ہوں یا بدشکل سب کو محرمات سمجھ کر ان کے کانوں میں کلمۂ حق پہنچانا چاہیئے۔

اتباعِ شریعت کی تلقین حضرت شاہ کلیم اللہ رح روحانی ترقی کے لئے اتباعِ شریعت کو ازبس ضروری تصور کرتے تھے۔ اُن کا عقیدۂ راسخ یہ تھا کہ شریعت سے ہٹ کر روحانی ترقی کے لئے جو کوشش کی جائے گی وہ نقش بر آب ثابت ہوگی چنانچہ جگہ جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

(۱) "برنہج شریعت باید رفت" — راہِ شریعت پر چلنا چاہیئے۔

م ۹۵ ص ۲۷

(۲) "ہمہ داخلانِ طریقت را تاکید نمایند کہ ظاہر شریعت آراستہ دارند و باطن بعشق مولےٰ پیراستہ سازند" م ۱۲۹ ص ۹۵

سب داخلانِ طریقت کو تاکید کرنی چاہیئے کہ ظاہر کو شریعت سے آراستہ رکھیں اور اپنا باطن عشق مولےٰ سے پیراستہ۔

اُن کا عقیدہ تھا کہ جو شریعت پر نہیں چلتا وہ گمراہ ہے اور طریقت وحقیقت کے منازل کبھی طے نہ کر سکے گا۔ فرماتے ہیں:۔

"آنچہ در شریعت راسخ نیست، ناقص است بلکہ طریقت وحقیقت او معلوم کہ حقیقتے ندارد۔ مرد آں ست کہ جامع باشد میاں شریعت و طریقت وحقیقت

م ۹۵ ص ۲۷

وہ شریعت کو معیار سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے کسی شخص کی روحانی بلندی وپستی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

"اے برادر در تفاوتِ فقرا اگر امروز خواہی کہ دریابی، بجانب شریعت او نگاہ کن کہ شریعت معیار است، عیار فقر بر شریعت روشن می گردد"

م ۹۵ ص ۲۷

فرماتے ہیں کہ اگر کسی شیخ کے دس صاحبِ کمال مرید ہوں اور ہر ایک اپنی علیحدہ وضع رکھتا ہو اور شیخ کو ہر ایک کے متعلق حسنِ ظن ہو اور عوام بھی اچھا سمجھتے ہوں اور تم یہ معلوم کرنا چاہو کہ کون شخص قیامت کے دن سب سے افضل ہوگا تو یہ دیکھو کہ ان دس آدمیوں میں سے کون شریعت کے ساتھ آراستہ ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو قیامت کے

یہی شخص سب سے بلند مرتبہ ہو گا۔

شریعت، طریقت اور حقیقت کا باہمی تعلق اس طرح بیان فرماتے ہیں :۔

" مینار حقیقت طریقت است، و مینار طریقت شریعت، آنکہ در چشم او جمال شریعت بیش بود طریقت وحقیقت اتم واکمل بود، علامت وصول بدرجۂ حقیقت این است کہ روز بروز تا فانا سالک را در شریعت قدم راسخ گردد " م ۱۱ ص ۸۵

آگے چل کر وہ ان صوفیۂ خام کی مذمت کرتے ہیں جنھوں نے شریعت کو ترک کر دیا تھا اور فرماتے ہیں :۔

ایں ملحدان کہ شریعت را از دست دادہ کلام لاطائل ملحدانہ بسبب گدائی و لقمۂ چرب نمودہ بہ متشرعان طعنۂ بے حقیقتی میزنند، تعزیر کردنی اند کہ ہمہ توحید ایشاں بے معنی است وبے لطفی قالی است بے حال زنہار در صحبت ہم چنیں حمقا نخواہند نشست "[ل۵] م ۱۱۰ ص ۸۵	یہ ملحد جنھوں نے شریعت کو ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے اور ملحدانہ باتیں لقمۂ چرب حاصل کرنے کے لئے بکتے ہیں اور متشرع لوگوں کو بے حقیقتی کا طعنہ دیتے ہیں، سزا کے قابل ہیں۔ اُن کی توحید سب بے معنی ہے۔ وہ حال سے خالی ہیں۔ ایسے احمقوں کی صحبت میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔

ل۵ شاہ کلیم اللہ صاحب رح کے بعد اس ہی قسم کے گمراہ کن صوفیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

وصیت دیگر آں نست کہ دست در دستِ مشایخ ایں زماں ہرگز نباید داد و بیعت ایشاں نباید کرد " وصیت نامہ ص ۳

امیروں کی اصلاح

شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کی خانقاہ میں جب دولت مندوں کا ہجوم بڑھا تو ان کو اس سے تکلیف ہوئی اور اس ماحول سے دل برداشتگی اور تنگی کا اظہار کیا، شاہ کلیم اللہ صاحب رح کو معلوم ہوا تو لکھا کہ ان لوگوں کو بھی نظر انداز نہ کرو، احیاءِ ملت اور ترویجِ سلسلہ کے لئے جب کوششیں کی جائیں تو سوسائٹی کے کسی حصے کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ دولت مندوں کو متاثر کرنا بعض دیگر مصلحتوں کی بناء پر بھی ضروری ہے، لکھتے ہیں :-

"مقصود از دخول اہل دول نہ آں است کہ ایشاں طے مراتب درویشی کنند...... مقصود آں است کہ بہ سبب دخول ایں مردم اکثر مردم دیگر داخل می شوند[۵۱]، و در نظر عوام دخول ایں مردم اعتبار تمام وارد۔"	اہل دول کے سلسلہ میں داخل ہونے سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ وہ درویشی کے مراتب و درجات طے کرلیں...... بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے شامل ہونے سے بہت سے اور لوگ سلسلہ میں داخل ہوجائیں گے چونکہ عوام کی نظر میں ان لوگوں کا سلسلہ میں شامل ہونا بہت اہمیت رکھتا ہے۔
م ۶ ص ۱۲	

پیرو مرشد کی اس ہدایت کے بعد شیخ نظام الدین نے دولت مندوں سے زیادہ پرہیز نہ کیا بلکہ ان کی اصلاح کی طرف بھی متوجہ ہو گئے۔ جب نتیجہ کوششوں کے برابر نہ پایا تو آزردہ خاطر ہوئے اور مایوس ہو کر شیخ کو لکھا کہ میں دولت مندوں

---

۵۱ ایک دوسرے مکتوب میں دولت مندوں کے متعلق لکھتے ہیں :-

"اینہا آلۂ رجوعِ خاص و عوام اند"

م ۱۸ ص ۲۲

کی صحبت سے تنگ آگیا ہوں۔ میری کوششیں بارآور نہیں ہوتیں۔ شاہ صاحبؒ نے سمجھایا کہ ان دولت مندوں سے زیادہ اُمیدیں وابستہ نہیں کرنی چاہئیں اُن کو فقیر یا درویش نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک مکتوب میں ارشاد ہوتا ہے:۔

بہ یقین شناسید کہ دولت منداں	اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ
ہرگز در ہیچ عصرے مرید ہیچ	دولت مند کسی زمانے میں بھی کسی شیخ
شیخ نشدہ اند، اگر شدہ دولت مند	کے مُرید نہیں ہوئے ہیں اگر ہوئے
نہ ماندہ، ہمہ را گذاشتہ لنگ	ہیں تو دولت مند نہیں رہے بلکہ
بستہ اند	سب کچھ چھوڑکر لنگوٹہ باندھ
	لیا ہے

م ۲۰ ص ۳۰

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کو ذکر و اشغال سے کیا تعلق یہ تو صرف منصب و وجاہت کے لئے تعویذ گنڈے کی فکر میں رہتے ہیں

(م ۵۴ ص ۴۴)

شاہ صاحبؒ نے اپنے مریدوں کو، بادشاہوں، امراء اور رؤساء سے ارتباط کی نوعیت سے بھی خبردار کرنا مناسب سمجھا، لکھا کہ مقصد یہ نہیں کہ تم ان سے بے حد تعلقات پیدا کر لو، ایسا کرنے سے کام میں خلل واقع ہوتا ہے اور روحانی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ شناسائی کا انداز یہ ہونا چاہیے کہ اگر خط لکھنا ہو تو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی طرح کہ بلبن کو ایک شخص کی سفارش لکھتے ہیں:۔

"میں نے اس شخص کا احوال اول خدا کی طرف پیش کیا ہے، پھر تیری طرف، اگر تو اُسے کچھ عنایت کرے گا تو حقیقت میں دینے والا خدا ہی اور تو مشکور اور اگر کچھ نہ دے گا تو حقیقت میں باز رکھنے والا خدا

ہے اور تو معذور ہے“

تملق، خوشامد اور دربارداری فطرتِ درویش کے خلاف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

(۱) ”ملاقاتِ سلاطین کہ بردر درویش آیند روا باشد اما بر در آنہا نباید رفت
م ۴۴ ص ۴۳

(۲) ”بردرِ ملوک نباید رفت و آیندہ ہر قسم کہ باشد او را منع از آمدن نباید کرد“
م ۷۵ ص ۶۰

(۳) درویش را باید کہ اختلاطِ بباد شاہاں نماید و بخانۂ اہل دول طواف نماید کہ اختلاط ملوک رونقِ ایمان می برد“[۵]
م ۶۵ ص ۵۵

سماع | شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کو اپنے زمانے کی جن گمراہیوں کے خلاف آواز اُٹھانی پڑی تھی ان میں ایک سماع بھی تھا۔ مشائخ سلسلہ چشت نے اس کو روحانی غذا سے تعبیر کیا تھا، لیکن ساتھ ساتھ اس کے سخت اصول بھی مقرر کر دئے تھے۔ جن کے بغیر وہ سماع کو قطعی ناجائز سمجھتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں ان اصولوں سے بے اعتنائی عام تھی، اور شاید ہی کوئی شیخ ایسا ہو جو اُن کی پوری طرح پابندی کرتا ہو، چنانچہ شاہ کلیم اللہ صاحب فرماتے ہیں

امروز قدر راگ مشائخ نمی شناسند   آج کل مشائخ سماع کی اہمیت

۵۔ انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:-
”در بعض ملفوظات بزرگان چشتیہ مذکور است کہ ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد نام او را از دیوان حق سبحانہٗ برمی آرند“ ص ۶۹

"و آداب را رعایت نمی کنند" — نہیں سمجھتے ہیں، اور اس کے قواعد کی پابندی نہیں کرتے ہیں۔ م ۱۰۵ ص ۸۳

چنانچہ وہ اس کو "بڑھائے ہوئے سماع" کہتے ہیں اور جگہ جگہ اس کو کم کرنے کی تلقین فرماتے ہیں:-

"اے برادر! بکثرتِ سماع ہم خوب ندارم بلکہ تعین ہر روز ہم نیادہ" — اے بھائی! سماع کی کثرت کو میں اچھا نہیں سمجھتا بلکہ ہر روز بھی اس کا تعین (مشایخ متقدمین کی) روایت نہیں ہے۔ م ۷ ص ۱۴

وہ ہدایت کرتے تھے کہ سماع کی بجائے مراقبہ میں وقت صرف کیا جائے۔

"حلقۂ مراقبہ وسیع از حلقۂ سماع باید کرد۔" م ۹۹ ص ۷۸ — مراقبہ کا حلقہ سماع کے حلقہ سے زیادہ وسیع کرنا چاہیئے۔

اکثر مکتوبات میں (م ۱۳، م ۹۷، م ۱۰۳، م ۱۲) مراقبہ ہی کی ہدایت ہے وہ زمانے کی حالت کو دیکھ رہے تھے اس لئے ڈرتے تھے کہ کہیں سماع کی شکل مسخ ہو کر نہ رہ جائے۔ فی نفسہ وہ اس کے مخالف نہیں تھے لیکن حالات نے ان کو اس معاملے میں سخت گیر بنا دیا تھا۔ وہ خود سب اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔ لہٰذا مریدوں کو بھی ہدایت تھی کہ :-

"مجلس سرود بطور ما کنند۔" — محفل سماع ہماری طرح سے کریں۔ م ۹۴ ص ۷۴

یہ زمانہ تھا کہ جب مشایخِ سرہند کے اثرات بہت زیادہ پھیل گئے تھے۔ بادشاہوں پر اُن کا اثر تھا، اور وہ ان کی رائے کی عزت کرتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے اس خیال سے کہ کہیں کوئی ناگوار صورت پیدا نہ ہو، اس امر کی کوشش کی کہ جہاں مشایخ

نقش بند کا اثر ہو وہاں سماع کو بند رکھا جائے۔ ایک مرتبہ جب کہ بادشاہ دکن میں تھا، مشائخ سرہند حج سے واپسی پر اس کے پاس پہنچے۔ شیخ کلیم اللہ دہلوی کو معلوم ہوا تو مرید کو خط لکھا کہ اس زمانے میں مجلسِ سماع کو موقوف رکھنا۔ بادشاہ کے ساتھ علمار سرہند ہیں کہیں ؛۔

"ہیجان مخالفاں نشود"

م ۹۴ ص ۷۴

وصال | آخر عمر میں شاہ صاحبؒ کو نقرس اور وجع المفاصل کے امراض لاحق ہو گئے تھے۔ ایک خط میں جو تقریباً ۸۰، ۷۹ سال کی عمر میں لکھا گیا ہے فرماتے ہیں:

"آزار نقرس و وجع المفاصل	نقرس اور گٹھیا کا مرض نہایت شدت
بافراط شده، که دست چپ و	سے ہو گیا ہے، بایاں ہاتھ اور داہنی
زانوئے پائے راست ہر دو	ٹانگ اور دونوں پاؤں پر ورم ہو گیا
پا آماسیده اند و چہار ماه است	ہے۔ چار مہینے سے صاحب فراش
که صاحبِ فراشم، دریں روز لنگ	ہوں۔ اس زمانے میں لنگڑاتا لنگڑاتا
لنگاں به استعانت چندے از	چند آدمیوں کی مدد سے اندر سے
اندروں به خانه می توانم رفت نماز	مکان جاتا ہوں، نماز تیمم سے اور

۵۱ اسی مکتوب میں لکھتے ہیں ؛۔

"امروز نہم جمادی الثانی است، سال عمر ہفتاد و ہشت است
چہارده یا پانزده روز باقی است که شروع سال نہم خواہد شد۔" م ۱۲۵ ص ۹۳
شاہ صاحبؒ نے ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

۵۲ فخر الطالبین اور مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ ٹانگ میں درد (بقیہ صفحہ ۲۰۰)

بہ تیمم نشستہ می خوانم — بیٹھ کر پڑھتا ہوں

م ۱۲۵ ص ۹۳

لیکن ان تکالیف کے باوجود وہ اعلائے کلمۃ الحق میں مصروف رہے۔ جامع مکتوبات کلیمی نے لکھا ہے :-

"در ہدایتِ خلق اللہ و اعلائے — خلقت کی ہدایت اور اعلائے
کلمۃ اللہ تا دمِ واپسیں کوشش — کلمۃ اللہ کے لئے آخری سانس تک
بلیغ بکار بردند" [۵۱] — کوشش کرتے رہے

بیماری کی حالت میں شیخ نظام الدین اورنگ آبادی رح کو خطوط لکھتے تھے اور ضروری ہدایات دیتے تھے۔

شاہ صاحب رح نے ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۷۲۹ء کو وصال فرمایا [۵۲]۔ انتقال کے وقت یہ بیت زبان پر تھی

(نوٹ بقیہ ص ۹۱) پاماس کی شکایت بزرگانِ چشت کی ایک پرانی خصوصیت ہے۔ خواجہ نور محمد فرماتے ہیں

"ازار نقرس یعنی ازار مفصل ابہام پائے و درد زانو موروثی پیرانِ ماست یعنی مولانا صاحب و شیخ صاحب و شیخ کلیم اللہ و شیخ یحییٰ مدنی ایں ہمہ بزرگاں ایں مرض می داشتند" مناقب المحبوبین۔ ص ۹۶-۹۵

مولوی محمد عمر نے لکھا ہے کہ شاہ نور محمد صاحب کو یہ مرض تھا۔ حاجی نجم الدین صاحب کا بیان ہے کہ حضرت شاہ سلیمان رح کو بھی یہی شکایت تھی (مناقب المحبوبین ص ۹۶) قاضی محمد عاقل صاحب کی ایک ٹانگ میں درد رہتا تھا (تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۳۸)

۵۱ مکتوبات کلیمی ص ۲

۵۲ آزاد بلگرامی (مآثر الکرام) نے سنہ وفات ۱۱۴۲ھ لکھا ہے۔ شجرۃ الانوار، خزینۃ الاصفیا، دیباچہ مکتوبات کلیمی میں ۱۱۴۲ھ ہے، اور یہی صحیح ہے۔ حدائق الحنفیہ میں ۱۱۴۰ھ لکھا ہے جو قطعاً غلط ہے (ص ۴۳۹)

غبار خاطر عشاق مدعا طلبی است
بخلوتے کہ منم یاد دوست بے او بیست [۵۱]

اپنی مسکونہ حویلی میں جو قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان واقع تھی، سپردِ خاک کئے گئے[۵۲]
اُن کے ایک مرید نے تاریخ وفات کہی ہے ؎

کلیم اللہ عارف صاف بودہ
باقلیم بقا شوقش ربودہ
پرسیدم چو تاریخ وفاتش
خرد گفتا کہ ذاتِ پاک بودہ [۵۳]

۱۱۴۲ھ

شاہ صاحبؒ کے مزار کے گرد ان کے خاندان کے افراد آباد تھے ۱۸۵۷ء تک یہ علاقہ بہت آباد اور بارونق تھا۔ غدر میں یہ آبادی تباہ و برباد ہوئی۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے:۔

درسال غدر چوں نصاریٰ بر اہل اسلام دہلی فتح یافتند مکانہائے کہ قریب لعل قلعہ بودند ہمہ را منہدم کردند [۵۴]

غدر میں جب نصاریٰ نے مسلمانوں پر فتح پائی تو لال قلعے کے قریب کے مکانات منہدم کر دئے۔

---

[۵۱] مناقب المحبوبین ص ۵۰
[۵۲] آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:۔ "در حویلی سکونت خود مدفون گردید" ص ۴۳
[۵۳] شجرۃ الانوار (قلمی)
[۵۴] مناقب المحبوبین۔ ص ۵۴

غالب ایک خط میں سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں :۔

"شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مقبرہ اُجڑ گیا، ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی، اُن کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے، اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔"[۵۱]

شاہ صاحبؒ کی خانقاہ بھی اسی ہنگامہ میں منہدم کر دی گئی۔ میاں نظام الدین نبیرۂ حضرت شاہ فخر الدینؒ نے غدر کے بعد مولانا نجم الدین کو بتایا تھا کہ

"من اجازت از انگریز گرفتہ ام	میں نے انگریز سے اجازت لے لی ہے۔
احاطہ برگرد مزار شریف ایشاں	ان کے مزار شریف کے گرد
تیار خواہم کرد۔"[۵۲]	احاطہ بنوا دوں گا۔

اولاد | شاہ صاحبؒ کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں[۵۳] تھیں۔ لڑکوں کے نام خواجہ محمد حامد سعید، محمد فضل اللہ، محمد احسان اللہ تھے۔ لڑکیوں کے نام تھے بی بی رابعہ، بی بی فخر النسا، زینب بی بی۔ خواجہ محمد کا انتقال، شاہ صاحبؒ کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، ان کی وفات پر شاہ صاحب نے ایک نہایت پُر درد خط لکھا تھا[۵۴] باقی اولاد کے متعلق ایک خط میں خود لکھتے ہیں[۵۵] :۔

---

۵۱ اُردوئے معلّٰی۔ حصہ اول ص ۱۸۲-۱۸۳

۵۲ مناقب المحبوبین ص ۵۸

۵۳ مناقب المحبوبین میں پانچ لڑکیاں بتائی ہیں، چوتھی اور پانچویں کا نام نہیں لکھا ایک کے متعلق لکھا ہے کہ بی بی رابعہ کے انتقال کے بعد محمد ہاشم صاحب سے ان کا نکاح ہو گیا تھا۔ (۵۴، ۵۵ صفحہ ۲۲۴ پر)

"سه فرزند و سه دختر موجوده اند،
حامد به کتب سلوک مشغول است
محمد فضل اللہ ده ساله دوازده
سیپاره قرآن حفظ کرده،
محمد احسان اللہ پنج ساله بکتب
شده بخواندن ابجد مشغول است
اما سه دختر، یکے بخانه محمد ہاشم
دادیم، بی بی رابعه[۵۵] نام دارد، دیگر بی بی فخر النسا برادر زاده[۵۶]
خود دادیم سیوم زینب بی بی
مشهور به بی بی مصری چهارده ساله
است تا حال جائے منسوب
نشده"

م ۱۲۵ ص ۹۳

تین بیٹے اور تین بیٹیاں موجود ہیں
حامد کتب سلوک کے مطالعہ میں
مشغول ہے۔ محمد فضل اللہ دس سال
کا ہے۔ ۱۲ پارے کلام پاک کے حفظ
کرلئے ہیں۔ محمد احسان اللہ پانچ
سال کا ہے۔ مکتب میں ابجد پڑھتا
ہے۔ لڑکیوں کا یہ ہے کہ ایک
محمد ہاشم کے نکاح میں ہے بی بی
رابعہ اس کا نام ہے دوسری بی بی
فخر النسار برادر زادہ کے نکاح میں
دیدی ہے۔ تیسری لڑکی زینب بی بی
جو بی بی مصری کے نام سے مشہور
ہے۔ ۱۴ سال کی ہے، ابھی کہیں اس
کی نسبت نہیں ہوئی ہے۔

(بقیہ نوٹ صن ۲۲۴) ۵۳ مکتوب ۲۱۴ ص ۴۰۔

۵۴ یہ خط شاہ صاحب رح نے تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں لکھا ہوگا۔ ایک مکتوب میں (م ۲۴) میں لکھا ہے کہ احسان اللہ ۷۵ سال کی عمر میں عطا ہوئے تھے۔ اس خط میں اُن کی عمر ۵ سال بتائی گئی ہے۔

۵۵ ایک مکتوب میں اُن کا نام بی بی شرف النسار لکھتے ہیں (م ۷۵ ص ۵۰)

۵۶ مناقب المحبوبین میں ان کا نام شیخ عبدالرحیم لکھا ہے (ص ۴۶)

شیخ محمد ہاشم ایک مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا حال شاہ صاحبؒ نے خود ایک مکتوب میں لکھا ہے[۵۱] اُن کے والد شاہ حسن دکن میں رہتے تھے۔ شیخ عبداللطیف دولت مندانی (کہ بادشاہ بایشان اخلاص داشت " م ۵۷) کے وہ مرید تھے، اور اُن ہی کے حکم کے مطابق الہ آباد آکر آباد ہو گئے تھے، محمد ہاشم الہ آباد سے دہلی تحصیل علم کے لئے آ گئے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی بڑی لڑکی اُن کے نکاح میں دے دی تھی۔

"چوں بسیار صالح و فقیر و فقیر زادہ بود ایں عقد منعقد شد" م ۵۷ ص ۵۱-۵۰	چونکہ بے حد صالح، فقیر اور فقیر زادہ تھے۔ اس لئے یہ رشتہ کر لیا گیا۔

شاہ صاحبؒ کی چھوٹی صاحبزادی بی بی مصری کے متعلق جامع مکتوبات نے لکھا ہے:-

"حضرت ایشاں بایشاں بسیار نظر التفات می داشتند، و تا حال فیضے کہ باولاد ایں معصومہ و عفیفۂ روزگار است بدیگراں دیدہ نمی شود" [۵۲]

بی بی مصری کی شادی شاہ میر سے ہوئی تھی [۵۳]

خلفاء | حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ کے خلفاء کی تعداد کثیر تھی۔ لیکن اُن کے خلفاء کی مکمل فہرست اور حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ مختلف تذکروں میں جن

---

۵۱ مکتوبات کلیمی۔ م ۵۷ ص ۵۱-۵۰

۵۲ مکتوبات کلیمی۔ ص ۳

۵۳ مناقب المحبوبین ص ۶۴

خلفاء کے اسماء گرامی ملتے ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) شاہ محمد ہاشمؒ

(۲) مولانا شاہ ضیاء الدینؒ

(۳) مولانا شاہ جمال الدین جے پوریؒ

(۴) مولانا شاہ جلال الدینؒ

(۵) مولانا شاہ محمد علیؒ

(۶) مولانا شاہ عبد اللطیفؒ

(۷) مولانا حافظ محمد عبد اللہؒ

(۸) مولانا عبد الصمدؒ

(۹) مخدوم شیخ تھاروؒ

(۱۰) شیخ بدیع الدین عرف شیخ مداری ناگوریؒ (قبر سنگھانہ)

(۱۱) خواجہ مصطفیٰ مراد آبادیؒ

(۱۲) سید محمد علیؒ

(۱۳) شیخ بدہنؒ

(۱۴) حافظ محمودؒ

(۱۵) حافظ سعید پسر شاہ صاحبؒ

(۱۶) شاہ اسد اللہؒ

(۱۷) قاضی عبد الوالیؒ ساکنہ بلدہ سنگھانہ

(۱۸) شاہ جلیل قادریؒ

لعل جہان کون و مکان فضل خلاق زمین و زمان
الحمد للہ والمنة کہ درین زمان مسعود دلوان محمود نسخۂ نادر الوجود در علم سلوک یعنی
کشکول کلیمی
از حضرت قطب العالم شاہ کلیم اللہ جہان آبادی قدس سرہ السامی باہتمام مولوی حافظ محمد عبد الاحد
در مطبع مجتبائی واقع دہلی ۱۳۰۸ بطبع مزین مطبوع جہان شد
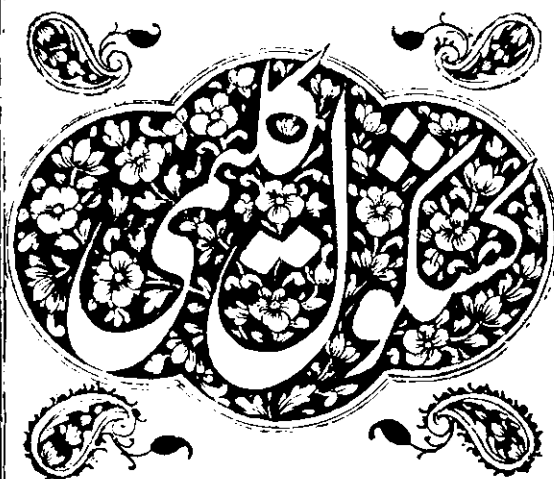
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

یہ ایک کشکول ہے۔ اس میں ایسے لقمے ہیں جو لطیفۂ ربانی کی غذا ہیں اور جن سے نفس ناطقہ تقویت حاصل کرتا ہے، جو مجازی اسلام کے پیکر میں ایمان حقیقی کی روح پھونک دیتے ہیں، جو مردہ طبیعتوں کو حیات جاودانی سے ہمکنار کرتے ہیں اور ہوائے نفسانی کے مریضوں کو شفائے رحمانی کے سرچشمہ تک پہنچاتے ہیں۔ یہ محض کتاب کے خشک اوراق نہیں ہیں بلکہ انواع و اقسام کے اذکار و افکار سے بھرے پُرے طبق ہیں۔ ان لقموں کو راقم سطور، کلیم اللہ، نے ارباب نعمت اور اہلِ کرم کے دروازوں سے بھیک مانگ کر ان لوگوں کی خاطر جمع کیا ہے جن کی بھوک (یعنی طلب) اتنی سچی ہے کہ اس میں کذب کا شائبہ تک نہیں۔ اس کشکول کے ہر لقمے میں وہ مزہ ہے جو ایک خاص قسم کی بھوک رکھنے والوں کے لئے مخصوص ہے اور ان کے سوا کوئی دوسرا اس کا اہل نہیں۔ ہر پارۂ نان سے جہاں بعض لوگوں کا ذوق لذت اندوز ہوگا وہاں بعض کو سوائے بے مزگی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ غرضیکہ یہ رنگارنگ نوالے اس مردِ قلندر کا حصہ ہیں جس نے ذوق طریقت کے ذریعے حقیقت کو (جو مقصود اصلی ہے) پا لیا ہے۔ جو ہر طرح کی روکھی پھیکی یا چکنی چپڑی پر راضی ہے تاکہ ہر طالب کو اس کی استعداد کے لحاظ سے حصہ پہنچائے اور ہر صاحب ذوق کو اس کے حوصلے کے مطابق یہ نعمت چکھائے۔

قبل ازیں میں نے "شہرستان شہود" کے عریاں تن باسیوں کی خاطر ایک مُرقع تیار کیا تھا تاکہ وہ اپنے جسموں کو لباس تقویٰ سے آراستہ کریں۔ آج جب کہ ماہ ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ کا آغاز ہے، بعض مخلص دوستوں کے اصرار پر میں نے یہ مانگے کے ٹکڑے اس کشکول میں جمع کئے ہیں تاکہ اہلِ ذوق وشوق ان سے بہرہ در ہوں اور دعائے خیر سے اس ناچیز کی امداد فرمائیں۔

نَسْأَلُ اللّٰهَ اَنْ لَا نَسْأَلَ مِنْهُ اِلَّا اِیَّاهُ بِعِزِّ مَنِ اجْتَبَاهُ لِاَوَّلِیَّةِ التَّنَزُّلَاتِ وَاصْطَفَاهُ۔

اللہ تعالیٰ سے ہمارا یہی سوال ہے کہ ہم اس سے اس کے سوا اور کچھ نہ مانگیں۔ (اور ہم اس ذات گرامیؐ کو اپنا وسیلہ بناتے ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے تنزلات میں سب سے پہلے تنزل کے لئے چنا اور جو اس کے پسندیدہ ہیں۔

مقدمہ

اے طالبِ حق! اللہ تعالیٰ تجھے عارفوں کے مدارجِ اعلیٰ پر فائز فرمائے، اس بات کو جان لے کہ وجودِ مطلق، پیشتر اس سے کہ وہ وجودِ ظلّی و کونی کے تعین میں ظاہر ہو، مخفی تھا یعنی اس بے نشاں کا کوئی نشان نہ تھا۔ پھر اس محبت کے تقاضے سے جو اُسے اپنے آپ سے ہے، وجودِ مطلق نے اس صرافت و بے نشانی سے نکل کر مراتبِ الٰہی وکیانی میں تنزل فرمایا اور ہر متعین میں اس تعین کی قید کے اعتبار سے عاشق اور رفعِ تعین کے اعتبار سے معشوق کہلایا۔ اب ہر تعین کا کمال اسی میں ہے کہ وہ اطلاق کی طرف رجوع کرے اور جس بے رنگی سے باہر آیا تھا پھر اسی میں لوٹ جائے۔ ہماری گفتگو کا موضوع بالخصوص حضرتِ انسان ہے جو ذات و صفات کا مظہر جامع ہے اور "حملِ امانت" کے باعث جملہ تعینات میں ممتاز ہے۔ انسان کا کمال اس میں ہے کہ وہ "فنا فی اللہ" کی سرحد پر پہنچ کر "بقا باللہ" کے ساتھ باقی ہو جائے۔ سیرِ اول سے مراد "سیر الی اللہ" اور سیرِ ثانی سے مراد "سیر فی اللہ" ہے۔ انتہائے کمال سیرِ اوّل میں ہے، سیرِ ثانی میں نہیں۔

وصل سے مُراد ماسوی اللہ سے قطع تعلق کر لینا اور جملہ مخلوقات سے توجہ ہٹا کر یہ رنگی

یا اطلاق میں فنا ہو جانا ہے۔ اس کا پیش خیمہ بیخودی اور جملہ حواس سے غیبت ہے۔ یہ حالت موت سے مشابہت رکھتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ موت میں حضور نہیں ہے۔ اور اس میں سوائے حضور کے اور کچھ نہیں جب سالک اس جگہ پہنچتا ہے تو ولایت اس کے لئے مسلم ہو جاتی ہے اگرچہ یہ حالت اس کو ایک ساعت کے لئے ہی میسر ہو۔ پھر اگر سالک کو صحو (یعنی حالتِ ہوش) میں لے گئے تو وہ صاحبِ تمکین کہلائے گا۔ حالت صحو کبھی تو جلد ہی نصیب ہو جاتی ہے اور کبھی دیر کے بعد ملتی ہے۔ اور اگر سالک اسی بیخودی یا سکر میں رہا تو اس کا شمار اربابِ تلوین میں ہوگا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ سلوک میں فقط ذات بیرنگ کے مشاہدہ میں فنا ہو جانا اگر سالک پیش نظر ہے تو اس کا سلوک پورا ہوگا۔ اور اگر اس کی نگاہ ادھر ادھر بھٹکتی رہی اور وہ دوسرے تعینات کے کشف کے پیچھے لگ گیا تو صراطِ مستقیم سے دور جا پڑے گا۔

لقمہ

کتب سلوک میں ہر مقام کے ایسے ایسے اوصاف اور خصوصیات درج ہیں کہ تم ان میں سے جس پر نگاہ ڈالو گے تمہارا جی چاہے گا کہ بس وہی ٹھہرے رہو۔ تم اپنی تمام ترہمت اس مقام کے حصول میں صرف کرنے پر آمادہ ہو جاؤ گے اور اسے حاصل کئے بنا تمہیں چین نہیں پڑے گا۔ لیکن کہا جاتا ہے: طلب الکل فوت الکل ۔ چنانچہ تم اسی تذبذب میں گرفتار رہو گے کہ تمہارے پیش نظر کونسا مقام ہے اور کس کی مشق کو مقدم رکھا جائے۔ علاوہ ازیں ہر مقام کو اختیار کرنے اور دوسرے مقام کی خاطر، اس کا ایثار کرنے ہیں جداگانہ شان ہے۔

لیکن اس ناچیز کے نزدیک اولیٰ یہ ہے کہ سالک فرائض، سنن مؤکدہ اور سنن زواید کی ادائیگی کے بعد پوری ہمت کے ساتھ (کلمہ) توحید کی مداومت کرے اور ذکر و فکر اور انس کے

مقام پر ثابت قدم رہے۔ اسے چاہیئے کہ کچھ عرصہ کثرت نوافل، تلاوت قرآن پاک، تسبیح، اوراد و وظائف اور اسی قسم کے دوسرے موارد ثواب کا ذخیرہ کرنے میں منہمک رہے۔ اسے یہ بھی لازم ہے کہ ہر طرح کی عبارت آرائیوں اور اشارتوں سے کنارکش رہے اور اعمال خیر کی ظاہری تزئین سے دامن بچا کر رات دن اپنی ہستی موہوم کو مٹانے اور فنا کرنے میں کوشاں رہے۔ یہاں تک کہ عنایت ازلی کی کشش اسے اس کی خودی میں سے نکال کر فنا فی اللہ کی سرحد تک پہنچا دے اور پھر وہاں سے بقاء البقاء کی جانب لے جائے تب سالک (حق تعالیٰ کی) ذات کو دیکھے گا اور اس کی صفات، آثار اور افعال کا نظارہ کرے گا۔

سالک کو لازم ہے کہ ہر وہ عمل جو اس کام میں اُس کو مدد دے، اختیار کرے اور جو بات حصول مقصد کی راہ میں اس کے سامنے رکاوٹ بنے، اس سے بچے۔ ہر صاحب شغل کا یہی طریقہ ہے اور تمام سلاسل اس بات پر متفق ہیں۔ لہٰذا طالب وصل کو وہ شغل اختیار کرنا چاہیئے جو اسے اس کی خودی سے نجات دلائے اور (جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں) اس باب میں ذکر و فکر سے بڑھ کر کوئی شے نہیں ہے۔ البتہ ذکر کی بعض قسموں کو بعض دوسری قسموں پر مقدم رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ ترتیب مشائخ کرام نے اسی طرح سے قائم فرمائی ہے۔

لقمہ

ذکر و فکر کی جتنی بھی قسمیں ہیں مشائخ کرام نے ان کی مختلف انداز میں تعریف کی ہے۔ لیکن سب سے عمدہ قول شیخ ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ کا ہے۔ فرماتے ہیں: ذکر کی چند قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک ذکر لسانی ہے جو ظاہر ہے۔ پھر ذکر قلبی ہے جو "ہوا جس نفسانی" اور وساوس شیطانی سے دل کو پاک کر لینا ہے تاکہ یادِ الٰہی میں انہماک پیدا ہو۔ علاوہ ازیں ذکر سر ہے اور یہ اپنے باطن کو اس طرح پُر کر لینا ہے کہ اگر کوئی خطرہ اندر گھسنا بھی چاہے تو راہ نہ پا سکے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ ذکرِ سرّ دراصل ذکرِ قلبی کا ثمرہ ہے۔ سرّ ایک لطیفہ ہے جو فوق قلب واقع ہے۔ دوامِ حضور "سرّ" کا مقتضا ہے قلب چونکہ ہر لحظہ منقلب ہوتا رہتا ہے اس لئے اس سے دوامِ حضور ممکن نہیں۔

ان کے علاوہ ایک "ذکرِ روح" بھی ہے۔ یہ ذاکر کا اپنی صفت سے فنا ہو جانا ہے۔ جب ذاکر دیکھتا ہے کہ خود حق تعالیٰ اس کا ذکر کر رہا ہے تو نہ اس کا ذکر باقی رہتا ہے نہ حال اور نہ وصف۔ کیونکہ اس نے اس بات کو جان لیا ہے کہ اس کے ذکر کرنے سے پیشتر اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کر رہا ہے۔

شیخ ابو عبد الرحمن سلمیؒ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ ذکر کی طرح فکر کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک سالک کا ان گناہوں اور معصیتوں پر جو اس سے سرزد ہوتی ہیں اور حقوق اللہ کی ادائیگی سے اپنے عجز پر غور و فکر کرنا ہے۔

فکر کی ایک اور قسم یہ ہے کہ سالک اس لطف و احسان پر غور کرے جو اللہ تعالےٰ نے اس کے ساتھ کیا ہے اور یہ بھی دیکھے کہ اس نے ترک شکر کیا ہے یا یہ کہ اگر شکر ادا کیا بھی تو وہ اللہ تعالےٰ کے احسانات کے مقابلہ میں کس قدر ناقص اور ہیچ ہے۔

پھر ایک قسم یہ ہے کہ سالک اس بات میں تفکر کرے کہ جو کچھ ازل سے ہو چکا ہے اب اس کا ظہور ہو رہا ہے۔ جو کچھ ہونے والا ہے، اس کو لکھ ڈالنے کے بعد قلم سوکھ چکا ہے۔ اب یا تو سعادت ہے یا شقاوت۔

ایک اور قسم کا تفکر صنایع و بدایع ملکی و ملکوتی میں غور و فکر کرنا ہے۔ اس سے سالک کے دل پر حق تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کا غلبہ تازہ ہو جاتا ہے اور اسے وعدہ و وعید یاد آ جاتے ہیں۔

اس کے بعد شیخ ابو عبد الرحمن فرماتے ہیں کہ متفکر کا جلیس نفس ہے اور ذاکر کا جلیس حق تعالیٰ شانہ ہے۔ اسی بنا پر آپ نے ذکر کو فکر پر ترجیح دی ہے۔

ذکر کو فکر پر جو ترجیح حاصل ہے اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ ذکر حق تعالیٰ شانہ کی صفت ہے جب کہ فکر کا معاملہ ایسا نہیں۔ لہٰذا جو صفت حق تعالیٰ کی ہے وہ لازماً کامل ہے اور جو صفت اس کی نہیں وہ ناقص ہے۔ علاوہ ازیں ذاکر کا رجوع ذات حق تعالےٰ کی طرف ہوتا ہے۔ کیونکہ ذکر معرفت و محبت کا نتیجہ ہے۔ اس کے برعکس متفکر نفس، وقت اور حال، قلت و کثرت، زیادتی اور نقصان وغیرہ میں تفکر کرتا ہے اور اپنے محاسبہ نفس میں لگا رہتا ہے۔

غرضیکہ ذکر فکر کا تابع ہے اور فکر ذکر کا۔ لیکن ذکر فکر سے بہت زیادہ کامل، اعلیٰ اور اصفیٰ ہے۔ کیونکہ فکر توبہ کا پیش خیمہ ہے اور ذکر (حق تعالیٰ کے) وصول کا مقدمہ ہے۔

ارشاد باری ہے:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ

(پس تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا)

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ذکر سے موصوف فرمایا ہے فکر سے نہیں۔

لقمہ ذکر قلب۔ ذکر روح۔ ذکر سرّ۔ ذکر خفی

عارف ربانی شیخ عبدالکریم الجیلی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ذکرِ قلب کے حاصل ہو جانے کی علامت یہ ہے کہ ذاکر اپنے ذکر کو ہر وقت یا کبھی کبھی اپنی قوت و استعداد کے مطابق، ہر شے سے یا بعض اشیأ سے سنتا ہے۔ ذکرِ روح کے حاصل ہونے کی نشانی یہ ہے کہ ذاکر جملہ اشیأ سے مخصوص تسبیحات سنتا ہے اور سوائے حق تعالیٰ کی اور کسی کو فاعل نہیں دیکھتا۔

احمد بن غیلان مکّی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ذکرِ قلب میں حضورِ حق اور حضورِ خلق دونوں برابر ہیں۔ اور ذکرِ روح میں حضورِ خلق کی نسبت حضورِ حق غالب رہتا ہے۔ ذکرِ سرّ میں ذاکر کو سوائے حضورِ حق کے اور کوئی حضوری نہیں ہوتی۔ اور ذکرِ خفی یہ ہے کہ وجود روح میں مخفی ہو جائے، جس طرح کائنات

سے میں مخفی ہوجاتی ہے۔

لقمہ

ذکر کا مقصود

ذکر نسیان کی ضد ہے۔ ہر وہ شے جو تمھیں تمھارے مقصود کی یاد دلائے اس کو وسیلہ بنانا یا اس کی طرف ملتفت ہونا عینِ عبادت ہے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ شے کوئی اسم ہے یا کوئی رسم یا فعل ہے وہ کوئی جسم رکھتی ہے یا مجرد ہے یا ان سب کے علاوہ کچھ اور چیز ہے۔ اس کے برعکس جس شے سے مقصود فراموش ہوجائے، وہ چاہے کوئی اسم ہو یا کچھ اور، اس کا وسیلہ چاہنا یا اس کی طرف متوجہ ہونا محض گمراہی اور بطالت ہے۔ تو معلوم ہوا کہ صوفی کے جملہ اقوال، افعال اور احوال عین ذکر ہیں بشرطیکہ ان سے یاد، بیداری اور آگاہی حاصل ہو۔ اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں ؎

گر با تو بوَم مجاز من جملہ نماز

گر بے تو بوَم نماز من جملہ مجاز

اگر میں تیرے ساتھ ہوں تو میرا مجاز بھی سراسر نماز ہے

اور اگر میں تیرے بغیر ہوں تو میری نماز بھی تمام تر مجاز ہے۔

لقمہ

بعض حضرات نے ذکر کی بہت سی قسمیں گنوائی ہیں۔ مثلاً ذکر لسان جو بآواز بلند بھی ہوسکتا ہے اور خاموشی کے ساتھ بھی۔ اس کے علاوہ ذکر قلب، ذکر رُوح ذکر خفی، ذکر اخفیٰ اور اخفی الاخفیٰ ہیں۔

ذکرِ لسان لفظی ہے یعنی اس میں حرفوں کی ہئیت، بعض حروف کی بعض پر تقدیم و تاخیر

اوران کی حرکات وسکنات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اگر ان الفاظ کو آواز کے ساتھ ادا کریں تو یہ "جہر" ہوگا۔ اور اگر بے آواز پڑھیں تو یہ خفیہ کہلائے گا۔

"ذکر قلب" صرف مطالعہ لفظ ہے۔ یا معنیٔ اسم کا دل میں حاضر جاننا۔ یعنی کسی اسم کے حروف اور حرکات وسکنات کو بلالحاظ تقدیم وتاخیر بیک مرتبہ دل میں لانا۔

"ذکر روح" لفظِ اسم کو بھول کر صرف مسمیٰ کو حاضر رکھنا ہے۔ اس میں ذکر کرنے والوں کو اپنے اپنے حالات کے مطابق فرق ہوتا ہے۔ یعنی بعض کو یہ کیفیت کبھی کبھار حاصل ہوتی ہے اور اکثر حاصل نہیں ہوتی۔ یا اس کے برعکس بعض لوگوں کو یہ کیفیت اکثر حاصل ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی نہیں بھی ہوتی۔ پھر بعض ایسے ہیں جن کو یہ کیفیت دائمی طور پر میسّر رہتی ہے لیکن وہ جانتے ہیں کہ ہم ذاکر ہیں ذکر میں مشغول ہیں۔ جس کا ذکر کر رہے ہیں وہی ہمارا مقصود ہے جو ہماری چشم بصیرت کے سامنے حاضر ہے۔ لیکن اس کیفیت میں بھی نقص موجود ہے۔ اعلیٰ اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ ذکر کا اور ذاکر کا درمیان میں کوئی نشان ہی باقی نہ رہے اور سوائے "مذکور" کے اور کچھ نہ ہو۔ یہاں تک کہ ذکر کی لذت بھی جاتی رہے بلکہ اس لذت کا علم بھی نہ رہے۔

"ذکر اخفیٰ" اور "اخفیٰ الاخفیٰ" کے مقامات بھی اس طرح ہیں۔ ان کے علاوہ جو باقی ذکر ہیں۔ ان کو انہی مذکورہ مراتب پر محمول کیا جاتا ہے۔

تقمہ

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ذکر چار طرح کا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ زبان ذکر میں مشغول ہے لیکن دل غافل ہے۔ دوسری یہ کہ زبان کے ساتھ ساتھ دل بھی ذکر میں مشغول ہے تاہم کبھی کبھی دل غافل ہوجاتا ہے جب کہ زبان بدستور

ذکر کرتی رہتی ہے۔ تیسری صورت میں زبان دل کے ساتھ اور دل زبان کے ساتھ پوری طرح موافق ہے لیکن کبھی کبھی دونوں غافل ہو جاتے ہیں۔ اور چوتھی صورت یہ ہے کہ زبان غافل اور بے کار ہے لیکن دل ذاکر و حاضر ہے۔ یہ مقامات کی انتہا ہے۔ اصل بات حضور اور آگاہی ہے اور یہی ذکر کی حقیقت ہے۔ یہی وہ مرتبہ ہے جہاں ذاکر اپنے دل کی آواز کو سنتا ہے اور سوائے اس کے اور کوئی دوسرا اس آواز کو نہیں سن سکتا۔

لقمہ

بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ بلندی کے واسطے ذکر، متوسط کے واسطے تلاوت قرآن پاک اور منتہی کے واسطے نماز نفل ان کے مناسب حال ہیں۔ لیکن یہ فقیر عرض کرتا ہے کہ اس راہ میں طالب کے لئے اقرب و اوصل[1] کام یہ ہے کہ وہ فقط ذکر خفی کو اپنے لئے لازم کرے اور اپنے دل کو نقش غیر سے پاک کرے، ماسوی سے توجہ ہٹا کر یکسوئی اختیار کرے۔ ہر وقت حضرت قدس کی حضوری اپنی موانست اور اس میں فنا ہونے کا عزم رکھے اپنے آپ کو اس کام میں ایسا مٹائے کہ اس کی ہستی کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایسا کرنے سے سالک کی بہت سی عبادات فوت ہو جائیں گی۔ لیکن کچھ ہرج نہیں ہے کیونکہ یہ ایسا کام ہے جو ہر نقصان کی تلافی کر دے گا۔

لقمہ

آدابِ ذکر

---

[1] : یعنی سب سے بڑھ کر مطلوب سے قریب کرنے والا اور مقصود سے واصل کرنے والا۔

اب ہم ذکر کے بعض آداب بیان کریں گے۔ کتاب "منہج السالک الی اشرف المسالک" میں جو آداب گنوائے گئے ہیں ان کی تعداد بیس ہے۔ ان میں سے پانچ ذکر شروع کرنے سے پہلے ملحوظ رکھے جاتے ہیں، بارہ وہ ہیں جن کی پابندی دورانِ ذکر کرنی چاہئے اور تین ایسے ہیں کہ ذکر سے فارغ ہو کر جن کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ وہ آداب جو ذکر سے پہلے کے ہیں، حسب ذیل ہیں :

(۱) توبہ
(۲) اپنے قلب کو مطمئن رکھنا
(۳) طہارت
(۴) اپنے شیخ سے استمداد (یعنی مدد چاہنا)
(۵) یہ جاننا کہ شیخ سے استمداد، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے استمداد ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استمداد حق تعالیٰ شانہٗ سے استمداد ہے۔

دورانِ ذکر کے آداب کی تفصیل یہ ہے :

(۱) مربع یا دو زانو بیٹھنا،
(۲) دونوں ہاتھ رانوں پر رکھنا،
(۳) مجلسِ ذکر کو خوشبو دار کرنا،
(۴) پاک وصاف لباس زیبِ تن کرنا،
(۵) حجرہ میں تاریکی رکھنا،
(۶) دونوں آنکھوں کو ڈھانپنا،
(۷) کانوں کے سوراخوں کو اچھی طرح سے بند کر لینا،

(۸) صورت شیخ کو (دل میں) حاضر رکھنا (اور یہ سب سے ضروری شرط ہے۔

(۹) ظاہر و باطن میں صدق رکھنا (صدق سے یہاں اپنے عمل کا عدم مبالغہ مراد ہے)

(۱۰) اخلاص رکھنا (اخلاص سے مُراد ریائے سے پاک رہنا ہے)،

(۱۱) کلمۂ توحید کو اختیار کرنا (یعنی اسے دوسرے اذکار پر ترجیح دینا)۔

(۱۲) کلمۂ طیبہ کے معنیٰ کو ہمہ وقت ذہن میں رکھنا کہ ہر موجودِ وہمی معدوم ہے اور موجودِ حقیقی جل شانہ کی طرف مراقب و متوجہ ہوتے وقت ہر موجود وہمی کی نفی ہو۔ (ناچیز کی رائے میں صورتِ شیخ کو حاضر رکھنے کی طرح یہ شرط بھی نہایت ضروری اور بے حد کار آمد ہے)۔

ذکر کے بعد کے آداب یہ ہیں:

(۱) ذکر کے بعد کچھ دیر تک خاموشی اختیار کیے رکھنا۔

(۲) سانس کو روکے رہنا، اور

(۳) ٹھنڈی اشیاء مثلاً سرد پانی یا ہوا سے پرہیز کرنا کیونکہ اس سے دل کی حرارت سرد ہونے کا اندیشہ ہے۔

صاحب "منہج" نے ذکر کے چند فواید بھی لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کلمہ توحید کا ذکر حضرتِ اقدس میں انس کا موجب ہے۔ اگر اس، ذکر کی کثرت کے باوجود انس میں کوئی اضافہ محسوس نہ ہو تو ذکر کرنے والے سے یقیناً بعض شرایط میں کوتاہی ہوئی ہے۔ اسے چاہئے کہ احتیاط کرے اور از سرِ نو ذکر کو شروع کرے۔ ابن عطار اللہ شاذلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے تو عرش عظیم میں حرکت

پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلمہ "جبروت" سے ہے، اس کی نسبت ملک سے ہے
یہ ملکوت کی طرف صعود کرتا ہے اور حقایقِ عالم سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

ایک فایدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہر صبح طہارتِ کاملہ کے ساتھ ایک ہزار بار اس کلمہ کو پڑھے تو اس پر اسباب رزق آسان ہو جائیں گے۔ اس ناچیز کے نزدیک یہاں "رزق" کے معنیٰ عام تر ہیں۔ یعنی یہ روحانی بھی ہو سکتا ہے اور جسمانی بھی۔

اگر کوئی شخص سوتے وقت یہ کلمہ ایک ہزار مرتبہ پڑھے تو اس کی روح عرش کے نیچے پہنچ کر اپنی قوت کے مطابق روزی پائے گی۔

اگر کوئی شخص دوپہر کے وقت یہ کلمہ ایک ہزار بار پڑھے تو شیطان شکست خوردہ ہو کر اس کے باطن سے نکل جاتا ہے۔

جو شخص ہلال کو دیکھ کر باطہارت کاملہ اس کلمہ کو ہزار مرتبہ پڑھے، اللہ تعالیٰ اسے تمام بیماریوں سے محفوظ رکھے گا

شہر میں داخل ہوتے ہوئے یا نکلتے وقت اگر کوئی شخص باطہارت یہ کلمہ ہزار مرتبہ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اسے تمام خطرناک اور خوفناک چیزوں سے محفوظ رکھے گا۔

جو شخص حضورِ قلب کے ساتھ ایک ہزار مرتبہ اسے پڑھ کر ظالم جابر کی طرف دم کرے۔ اللہ تعالیٰ اس ظالم کو پایمال اور نیست و نابود کر دے گا۔

اگر کوئی شخص اس کلمہ کو ایک ہزار بار باین نیت پڑھے کہ اس پر غیب کی باتیں ظاہر ہوں تو اللہ تعالےٰ اس پر ملک و ملکوت کے پردے کھول دے گا۔

جو کوئی اس کلمہ کو ستر ہزار مرتبہ پڑھے، اللہ تعالیٰ اسے بلاحساب بہشت میں داخل فرمائے گا۔

لقمہ — دل کا ذاکر ہونا

بعض عارف فرماتے ہیں کہ ذکر لسانی سے سالک ذکر قلب کو پہنچ جاتا ہے ۔ لہٰذا جب زبان اور دل دونوں یکساں ہیں تو بلاشبہ ذکر بہ ترتیب کمال کو پہنچ جائے گا ۔ اکثر سلاسل میں یہی ترتیب رکھی گئی ہے ۔ مگر سلسلۂ نقشبندیہ میں جذبِ باطن کے ساتھ ذکر قلبی پر اقتصاد کرتے ہیں ۔ مبتدیوں کا اسی ذکر سے آغاز کروایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ؎

اوّل ما آخر ہر منتہی　　　آخر ما جیب تمنا تہی

ہمارا "اول" ہر منتہی کا "آخر" ہے ۔ اور ہمارا "آخر" یہ ہے کہ تمنا کی جیب خالی ہو (یعنی کوئی خواہش اور آرزو باقی نہ رہے)

لیکن ظاہر ہے کہ دوسرے سلاسل کے منتہی لوگوں کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اس سلسلے کے مبتدی کو حاصل نہیں ہوتا ۔ ہاں اس سلسلے میں تربیت کا طریقہ یہی ہے ۔ لہٰذا دوسرے سلسلے کے منتہی ، جو ذکر قلبی کے ساتھ مجذوب ہیں اور اس سلسلے کے مبتدی جن کو ذکر قلبی کے ذریعہ جذبِ باطن حاصل ہوتا ہے ان دونوں میں فرق ہے ۔

لقمہ — ذکرِ قلبی

بعض فقہا ذکرِ قلبی کا انکار کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک ذکر فقط ذکرِ لسان ہے ۔ یہ محض کج بحثی ہے کیونکہ ذکر ، نسیان کا ضد ہے ۔ اور یہ خاص طور پر قلب کی صفت ہے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ہر ایک کے واسطے مخصوص احکام ہیں جو اسی پر مترتب ہوتے ہیں ۔

لقمہ — حبسِ دم کے طریقے

بعض کے نزدیک حبسِ دم ذکر کے لیے بنیادی شے ہے بلکہ خطرات کو دُور کرنے کے لئے یہ اصل الاصول کا درجہ رکھتا ہے۔ چشتیہ، کبرویہ، شطاریہ اور قادریہ۔ ان تمام سلاسل کے ہاں (ذکر کے لئے) یہ ایک لازمی شرط ہے۔ نقشبندیہ نے اگرچہ اسے شرط قرار نہیں دیا، تاہم وہ اس کی اہمیت کا انکار نہیں کرتے۔ البتہ سہروردیہ کے نزدیک حبسِ دم کا نہ ہونا شرط ہے۔ حضرت بہاء الدین عمر اور حضرت زین الدین خوافی قدس سرہما کا یہی مسلک ہے۔ یہ دونوں حضرات سلسلہ سہروردیہ کے اکابر میں سے ہیں۔

یہ ناچیز عرض کرتا ہے کہ یہاں دو صورتیں ہیں۔ پہلی حبسِ دم اور دوسری حصرِ دم پھر حبسِ دم بھی دو طرح کا ہے یعنی تخلیہ اور تملیہ۔ تخلیہ میں سانس کو شکم کی طرف سے اور ناف اور اس کے اطراف کو پشت کی جانب کھینچتے ہیں اور سانس کو بعض کے نزدیک سینہ میں اور بعض کے نزدیک دماغ میں روکتے ہیں۔ اس کی حاجت نہیں کہ انگلیوں کو ناک کے پروں اور دونوں آنکھوں پر رکھا جائے یا دونوں کانوں میں ٹھونسا جائے جب کہ بعض لوگ احتیاطاً ایسا کرتے ہیں بس کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ کسی حوض میں غوطہ لگا کر یہ عمل کریں۔ یہ طریقہ خضر علیہ السلام نے حضرت عبدالخالق غجدوانیؒ کو تعلیم کیا تھا اور یہ ایسا طریقہ ہے جس سے بڑے فائدے اور تاثیر کی امید ہے۔

رہا تملیہ تو اس میں سانس کو پیٹ کی طرف کھینچ کر پیٹ کو پھلا لیتے ہیں اور سانس کو روک لیتے ہیں۔ اس صورت میں نفخِ شکم کے باعث ناف پشت سے بہت پرے ہٹ جاتی ہے۔ لیکن اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے بہت زیادہ حرارت پیدا ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ کھانا بہت ہضم ہوتا ہے۔

حصرِ دم یہ ہے کہ سانس کو دونوں جانب (یعنی آمد و رفت) سے منقطع کر دیا جاتا ہے
یوں سمجھو کہ عام طور پر جتنا لمبا سانس لیا جاتا ہے اس سے قدرے کم مقدار میں سانس لیتے ہیں۔
اگرچہ یہ عمل بھی دل میں حرارت پیدا کرتا ہے تاہم حبس دم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی حرارت
اس سے زیادہ ہوتی ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کا تعلق "دمِ مسافر" سے ہے۔ "دمِ مقیم" حرارت و برودت کے اوصاف
سے پاک ہے۔ اس کے بدلنے کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ تو ایک جدا نہ ہونے والی
شے ہے۔ حبس دم ہو یا حصرِ دم، "دمِ مقیم" ہر حال میں برقرار رہتا ہے۔ اگر کوئی اس کو جان
لے اور ہر ذکر کا معیار سمجھ لے تو وہ شخص دایم الذکر ہو جاتا ہے۔ سلسلہ حضوری اس کے ساتھ
پوری موافقت کرتا ہے، وہ جتنا اس کی مدت کو بڑھانا چاہے گا اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔
حبس دم کے ایام میں ترش اور زیادہ رطوبت والی غذاوں سے پرہیز لازم ہے۔ شروع
میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کانوں سے یا ناک سے یا پاخانے میں خون آنے لگتا ہے۔
لیکن اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ طالب کو چاہیئے کہ اپنے کام میں لگا رہے۔ یہ
کیفیت جلد ہی رفع ہو جایا کرتی ہے۔ البتہ بہت گرم کھانے سے بچنا چاہیئے کھانے کی
گرمی یا طبعی ہوتی ہے یا عارضی[1] دونوں صورتوں میں پرہیز کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ
اس سے مرض کے پیدا ہونے یا بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔

علاوہ ازیں "حبس دم" کی مدت کا اندازہ کرنے کے لئے جو گنتی مقرر کی جائے اس
کو یکلخت اتنا نہ بڑھا دینا چاہیئے کہ یہ عمل ہی دشوار ہو جائے اور اتنے طویل عرصے تک سانس

---

[1]: طبعی گرمی سے مراد کھانے کے اجزا کا بلحاظ تاثیر کسی نہ کسی درجہ میں گرم ہونا ہے۔ اس کی
تصریح طب کی کتابوں میں موجود ہے۔ اور عارضی گرمی یہ ہے کہ جیسے ہی کھانا پک کر تیار ہو چولہے
پر سے اتارتے ہی اسے کھانا شروع کر دیا جائے اور اس کے ٹھنڈا ہونے کا بھی انتظار نہ کیا جائے۔

کو روکنا شاق گذرنے لگے۔ اس مدت کو آہستہ آہستہ اور بتدریج بڑھاتے رہنا چاہئے۔ نیز سانس کو چھوڑتے وقت اس بات کی احتیاط ضروری ہے کہ سانس دھیرے دھیرے اور ناک کی راہ سے خارج ہو۔ منہ کے راستے ہرگز نہ نکالنا چاہئے، اس سے دانتوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حبس دم کرتے وقت نہ تو معدہ بالکل پُر ہو اور نہ بالکل خالی، بلکہ متوسط حالت میں ہونا چاہئے۔ مگر یہ شرط صرف مبتدیوں کے لئے ہے۔ جو شخص درجہ کمال کو پہنچ چکا ہو اسے اختیار ہے کہ جب اور جس حالت میں چاہے، سانس کو روک لے یا چھوڑ دے۔

مشائخ کرام نے یہ عمل اور حبس دم کے دوسرے طریقے جوگیوں سے اخذ کئے ہیں۔ جو لوگ اس کام کے اہل ہیں وہ اس پر نہایت عمدگی اور باقاعدگی کے ساتھ کاربند رہتے ہیں۔

لقمہ

بعض اہلِ معرفت فرماتے ہیں کہ جب انسان کا نفس تنقیۂ باطن کر لیتا ہے اور محسوسات و مالوفات کی خواہش سے تہی ہو کر استغراقِ ذکر اور نعمتِ حضوری سے معمور ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان کو روحانیات سے ایک نسبت یا ربط پیدا ہو جاتا ہے اور اس نسبت سے اس کا دل روشن ہو جاتا ہے۔ تب وہ اُس نور سے ذاتِ حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے اور احکامِ الٰہی سے اسے مراداتِ اُو تعالیٰ کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ پھر وہ نور اس کی بصیرت سے اس کی بصارت میں (بھی) آجاتا ہے جس کے باعث وہ اپنے ظاہری اعضاء سے عوالمِ غیب کا ادراک کرنے لگتا ہے۔ (جب یہ ہو جائے) تو اس وقت یہ شخص اپنے ظاہر و باطن (یعنی دونوں لحاظ) سے اس عالم سے نکل جاتا ہے۔

لقمہ — حیرت ممدوحہ و مذمومہ

مقامات میں سب سے پہلا مقام توبہ ہے اور سب سے آخری حیرت بعض حضرات نے رضاو تسلیم کو آخری مقام قرار دیا ہے اور اسے حیرت کی جگہ رکھا ہے۔

حیرت دو قسم کی ہے:

حیرت مذمومہ اور حیرت ممدوحہ۔

اس کی تشریح یوں ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کا جمال و کمال حیرت کا تقاضا کرتا ہے نہ کہ شک کا کبھی کبھی حیرت اور شک میں اشتباہ ہو جاتا ہے (یعنی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی شے ہیں)، تو جاننا چاہئے کہ حیرت ذاتِ شے کی معرفت اور ادراک سے پیدا ہوتی ہے اس کے برعکس شک جہل اور ناآشنائی کا نتیجہ ہے۔ حیرت حضور میں ہوتی ہے اور شک غیبت میں۔ متحیر آناً فاناً بلندی کی طرف صعود کرتا ہے اور کُنہِ شے تک پہنچ جاتا ہے کیونکہ اسے اس کے ادراک کا شوق ہوتا ہے جب کہ متشکک اتنی ہی تیزی سے جہل کی پستی میں جاگرتا ہے کیونکہ اسے حقیقت شے معلوم کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

کہتے ہیں کہ حیرت دو چیزوں سے مرکب ہے:

(۱) جزءِ علمی یعنی "وجود شے" کا علم، اور
(۲) جزءِ جہلی یعنی کُنہ شے" سے لاعلمی۔

مگر شک ان دونوں میں متذبذب ہے، یعنی شک میں نہ تو جزءِ علمی پایا جاتا ہے نہ جزءِ جہلی، متشکک کا علم مشکوک الوجود ہے اور اس کا جہل مشکوک الثبوت۔ وہ ہمیشہ نفی اور اثبات کے درمیان چکر کاٹتا رہتا ہے۔ یہی وہ شک ہے جسے حیرت مذمومہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل جو کچھ ہے اسے حیرتِ ممدوحہ کہتے ہیں۔ حیرت مذمومہ عوام کا حصہ ہے، جب کہ

عیرتِ ممدوحہ خواص کا نصیب ہے۔

لقمہ انوار

انوار جو ظاہر ہوتے ہیں ان کا رنگ کبھی سفید ہوتا ہے، کبھی سبز، کبھی عقیق جیسا اور سب سے آخر میں سیاہ۔ یہ سیاہ نور جبروت کا نور ہے۔

اگر نور داہنی طرف کندھے سے متصل ظاہر ہو تو وہ نور کاتبِ یمین (یعنی داہنے کندھے والے کاتب) کا ہے۔ اگر کندھے سے متصل نہ ہو تو وہ شیخ کا نور ہے۔ اگر سامنے سے ظاہر ہو تو وہ نور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔

اگر نور بائیں جانب سے ظاہر ہو اور بائیں کندھے سے ملا ہوا ہو تو وہ کاتبِ یسار (بائیں کندھے والے کاتب) کا نور ہے۔ اگر کندھے سے متصل نہ ہو تو یہ شیطان کا فریب ہے۔ اسی طرح اگر بائیں جانب سے کوئی صورت ظاہر ہو تو وہ بھی شیطانی فریب ہے۔

نور اگر اوپر یا پیچھے کی جانب سے ظاہر ہو تو سمجھ لو کہ یہ محافظ فرشتوں کا نور ہے۔

اگر نور بلا جہت کے ظاہر ہو اور اس سے خوف پیدا ہو اور اس کے زائل ہو جانے کے بعد حضور باقی نہ رہے تو جان لو کہ یہ بھی شیطانی فریب ہے۔

لیکن اگر ظہورِ نور کے وقت حضور حاصل رہے اور اس کے جانے کے بعد فراق اور اشتیاق پیدا ہو تو یقیناً یہ مطلوب کا نور ہے۔

نور اگر سینہ یا ناف کے اوپر ظاہر ہو تو شیطانی فریب ہے اور اگر دل کے اوپر ظاہر ہو تو یہ صفائے قلب کے سبب سے ہے۔

بہر حال طالب صادق کو ان انوار میں سے کسی پر مطمئن یا نازاں نہ ہونا چاہئیے۔

لقمہ — دوامِ مشاہدہ

اس بات میں اختلاف رائے ہے کہ عارف کے لیے مشاہدہ دائمی ہوتا ہے یا نہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دائمی ہوتا ہے جب کہ دوسرا گروہ اس کے عدمِ دوام کا قایل ہے۔ ایک عارف فرماتے ہیں :

مُشَاهَدَةُ الْاَبْرَارِ بَيْنَ التَّجَلِّي وَالْاِسْتِتَارِ

نیکوں کا مشاہدہ تجلی اور پردہ کے درمیان ہے ۔

حق بات یہ ہے کہ جس وقت ربطِ قلب، اور اتصالِ سِرّ خوب محکم و متحقق ہو جاتا ہے تو "وصول" ہرگز زایل نہیں ہوتا۔ ہاں انوار و مکاشفات کبھی ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے ۔ اور یہی معنٰی ہیں صوفیہ کے اس قول کے کہ :

اَلْوَقْتُ سَيْفٌ قَاطِعٌ وَ بَرْقٌ لَامِعٌ

وقت کاٹ کر رکھ دینے والی تلوار اور چمکنے والی بجلی ہے ۔

لقمہ — نہایتِ عرفان

غیبت و بیخودی اور محویت و فنا میں ایسی حالت ہوتی ہے جو بیان میں نہیں آ سکتی ۔ اس وقت سوائے حق تعالےٰ شانہ کی احدیت اور وجودِ مطلق کے اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ "اُو تعالیٰ شانہ کا وجودِ مطلق تو احاطۂ ادراک میں آ ہی نہیں سکتا کیونکہ جو کچھ ادراک میں آئے گا وہ حادث ہو گا۔ پھر جو صورت ذہن میں آتی ہے وہ عوالم ہی سے تعلق رکھتی ہے اور ہر عالم

حادث ہے۔ حادث وجود مطلق نہیں ہو سکتا، کیونکہ وجود مطلق قدیم ہے۔ اور قدیم ہمارے ادراک میں نہیں آسکتا؛ ہم کہیں گے کہ ہاں، اس نے ٹھیک کہا ہے مگر بات یہ ہے کہ حالتِ فنا میں سالک کو وہ نسبت جو دونوں طرف (یعنی منسوب اور منسوب الیہ) کے اثبات کا تقاضا کرتی ہے فراموش ہوتی ہے اور وہ اس سے قطعاً غافل اور معطل ہوتا ہے۔ اسے "فنائے فنا" کہتے ہیں۔ یہاں عدمِ ادراک ہے نہ کہ ادراکِ عدم۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الْاِدْرَاكِ اِدْرَاكٌ

ادراک کا ادراک نہ ہونا ہی ادراک ہے۔

اس قول میں بھی یہی نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ پوچھے کہ حضرات صوفیہ کے اقوال میں جو اصطلاحات آتی ہیں ــــــ یعنی شہودِ ذات، تجلیِّ ذات، محبتِ ذات اور معرفتِ ذات ــــــ ان کے معنی کیا ہیں اور یہ امور کیونکہ متحقق ہوتے ہیں؟ تو ہم جواب دیں گے کہ عرفان کے نتائج میں یہ بات شامل ہے کہ ہر شئے کو اس کے مرتبہ پر رکھا جائے اور ہر شئے کا جو کچھ حق ہے اسے دیا جائے۔ اب اس معاملے میں جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں، دو امور ہیں:

ایک ذاتِ بحتِ خالص و سادہ، اور

دوسرے میں وہ سب کچھ آجاتا ہے جو ذات کے ماسویٰ ہے۔

ان دونوں امور میں سے پہلے کا حق یہ ہے کہ اس کا اثبات کیا جائے اور دوسرے کا حق یہ کہ اس کی نفی کی جائے۔ اول میں معرفت کا حق یہ ہے کہ اصلاً پہچانا نہ جائے اور دوسرے میں معرفت کا حق یہ ہے کہ جیسا ہے ویسا پہچانا جائے۔ جو شخص اول میں معرفت کا قصد کرتا ہے اور دوسرے میں عدمِ معرفت کا، وہ کام سے بہت دور ہے۔ پس اثباتِ حق، حق اور اثباتِ باطل، باطل، یہی معرفت ہے۔ کسی شئے کے عدمِ معرفت سے یہ تو لازم نہیں کہ درحقیقت وہ شئے موجود ہی نہ ہو۔ پس حق سبحانہ و تعالیٰ کی ذات مقدس، مثبت، محقق، غیر معروفہ، ہے، لہٰذا شہودِ ذات

کے معنیٰ ہیں وراءِ ذات امور سے غیبت، تجلّیٔ ذات کے معنیٰ ہیں کہ یہ امور بصیرت سے پوشیدہ ہو جائیں، محبتِ ذات کے معنیٰ ہیں کہ ان امور سے محبت منقطع ہو جائے اور معرفتِ ذات کے معنیٰ ہیں کہ ان امور سے شناسائی نہ رہے۔ اسی پر ان تمام معانی کو جن کی اضافت ذات کی طرف ہے، قیاس کر لو۔ پس حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی معرفت صرف اس کے اسماء، وصفات وافعال میں ہوتی ہے اور وہ بھی کُنہ میں نہیں بلکہ اوپری سطح تک محدود ہے۔ کیونکہ ہر شے کی کنہ کی معرفت کا راستہ ہی بند ہے، یہ اس لیے کہ ہر شے کی کنہ حقیقتِ حق ہے اور یہ اس لیے کہ اُو تعالیٰ ہی ساری حقیقتوں کی حقیقت ہے اور حق جل شانہٗ کی حقیقت کسی انسان، فرشتے یا جن کے ادراک میں نہیں آسکتی۔ پس (معلوم ہوا کہ) حقیقت تمام تر مدرک نہیں ہوتی۔ یہ مرتبہ نہایتِ عرفان کا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ

اَوَّلُ الْعَوَامِ آخِرُ الْخَوَاصِ وَبِدَايَةُ الْجُهَّالِ نِهَايَةُ الْعُلَمَاءِ

عوام کا اول خواص کا آخر ہے اور جہلا کی ابتدا علماء کی انتہا ہے۔

لیکن ع

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(ذرا راستے کا فرق تو دیکھو کہ کہاں سے کہاں تک ہے۔)

لقمہ — ہمتِ شیخ

یاد رہے کہ اشغال واذکار اور افکار کی یہ ساری ترتیب محض اصطلاحی ہے لیکن جس ترتیب کا تعلق "ہمت" سے ہے وہ کچھ اس دوڑ دھوپ پر موقوف نہیں ہے۔ یہاں شیخ مرید کا تخلیہ شریعت کی نہج پر فرماتا ہے اور مُرید، غایب ہو یا حاضر، اس کے حق میں شیخ کی امداد "ہمت" سے ہوتی ہے۔ شیخ کی ہمت سے ہی فیوضات کے دروازے مرید پر کھلتے ہیں اور

یہ طریقہ بہت نادر ہے۔ اکثر بوالہوس اس کے جویا رہتے ہیں کیونکہ طریقت کے کام ان سے ہو نہیں سکتے اور اس راہ کی دشواریوں سے ان کا جی چھوٹ جاتا ہے لہٰذا انھیں اس طریقے کی آرزو رہتی ہے۔

لقمہ — ضرورتِ شیخ

کہا گیا ہے کہ "من لیس لہ شیخ فشیخہ الشیطان" یعنی جس کا شیخ نہیں ہے اس کا شیخ شیطان ہے۔ اس قول کی رُو سے ہر صاحب دل کے لیے ضروری ہے کہ شیخ کو تلاش کرے۔ اب یہاں پر ایک مشکل در پیش آتی ہے یعنی چونکہ وہ خود مبتدی ہے اس لیے مصلح اور مفسد میں یا ولی اور غیر ولی میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ یا تو وہ اچھوں پر قیاس کر کے مفسدوں کو مصلح سمجھ بیٹھے گا یا اس کے برعکس بروں پر قیاس کر کے مفسد جانے گا۔ دونوں صورتوں میں وہ غلطی پر ہوگا۔ (پھر کیا کرنا چاہیے؟) شیخ شرف الدین یحیٰی منیری قدس سرہ اس مشکل کا حل یوں بیان کرتے ہیں کہ عادتِ الٰہی اور سنت خداوندی اس طرح جاری ہے کہ کوئی زمانہ مشایخ و زہاد و عباد و اوتاد و اخیار و نجبار و نقبار و ابدال و اقطاب اور غوث اور تمام اہل اللہ اور اہل خدمات اور عاشقین و معشوقین سے خالی نہیں رہا، نہ ہے اور رہے گا۔ پس طالب صادق پر لازم ہے کہ جو مشایخ اس طریق پر چلتے ہیں اور اس بات میں معروف ہیں ان کی خدمت میں پابندی کے ساتھ حاضر ہو اور ان کی مجالس میں بار بار جائے اور ہر بار اپنے دل کو ٹٹولے اور دیکھے کہ طرح طرح کے وسوسوں اور خطرات کا ہجوم جو اس کے دل پہ جما ہوا ہے، وہ دُور ہوا یا نہیں۔ آیا کسی مجلس میں اسے قلب کے انقلابات سے رہائی ملتی ہوئی محسوس ہوتی ہے یا وہی پہلی سی حالت ہے۔ اگر طالب کو کچھ بھی خطرات و وساوس سے قلب کی رہائی محسوس ہو تو اسے چاہیے کہ جس

بزرگ کے دروازے سے اسے یہ دولت ہاتھ لگی ہے اس کی صحبت اپنے اوپر لازم کرلے۔ کیونکہ اگر قلیل صحبت سے یہ نعمت میسر آئی ہے تو زیادہ (مستقل) صحبت سے تو بہت کچھ امید ہے۔ لیکن اگر اسے اپنی حالت میں کوئی تفاوت محسوس نہ ہو تو سمجھ لے کہ اس شیخ کے ہاں میرا نصیب نہیں ہے اور دل میں انکار لائے بغیر اپنی دوا کسی دوسرے دروازے سے طلب کرے۔

تتمہ — شیخِ کامل کے ملنے کی دُعا

شیخ محی الدین ابو محمد عبدالقادر الجیلی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جو شخص آدھی رات کو اُٹھ کر وضو کرے اور دو رکعت نماز پڑھے اور جتنا ہو سکے ان دو رکعتوں میں قرآن پاک کی تلاوت کرے پھر بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہو کر بڑی الحاح وزاری کے ساتھ استغاثہ کرے اور مندرجہ ذیل دعا پڑھے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس پر وصول کا دروازہ کھول دے گا اور اسے اپنے کسی ایسے ولی کے پاس پہنچا دے گا جو اس طالب کی رہنمائی کر کے اسے حق تعالیٰ کی طرف پہنچا دے۔ اس دعا کا بارہا تجربہ کیا جا چکا ہے اور یہ حسبِ ذیل ہے :

يَا رَبِّ دُلَّنِي عَلٰى عَبْدٍ مِنْ عِبَادِكَ الْمُقَرَّبِيْنَ حَتّٰى يَدُلَّنِيْ عَلَيْكَ وَيُعَلِّمَنِيْ طَرِيْقَ الْوُصُوْلِ اِلَيْكَ ۔

اے پروردگار! تو مجھے اپنے بندوں میں سے کسی ایسے بندے کی طرف میری رہنمائی فرما کہ وہ میری رہنمائی کرے تیری طرف اور تیرے وصول کی راہ مجھے بتائے۔

سلسلۂ شاذلیہ (قدس اسرارہم) کے متاخرین نے فرمایا ہے کہ جو شخص ہمیشہ حضورِ قلب کے ساتھ بلاناغہ درود شریف اور اسی طرح کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ پڑھتا رہے گا اسے ضرور شیخ کامل ملے گا۔ شاذلیہ کا کہنا ہے کہ اس راہ میں ہمارے پیشوا امام حسن رضؓ بن علیؓ ہیں۔

وصل اول

اللہ تعالیٰ تمھیں اس بات کی توفیق دے جو اسے پسند ہے اور جس سے وہ راضی ہے ،
جان لو کہ جب کوئی طالب صادق شیخ کامل کی خدمت میں کسب طریقہ کے لئے حاضر ہوتا ہے
تو شیخ کو چاہیئے کہ اُسے متواتر تین روزے رکھنے کا حکم دے ۔ اگر ممکن ہو تو (طالب) طے کے
روزے رکھے ورنہ تھوڑا سا کھا کر افطار کر لیا کرے اور ہر روز ایک ایک ہزار مرتبہ لاالہ الا اللہ
استغفراللہ اور درود پڑھے ۔ تیسری شب جب وہ غسل کر کے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو تو شیخ
اسے سورہ فاتحہ ، سورہ اخلاص ، آمن الرسول استغفار اور شھد اللہ تا حکیم پڑھنے کو
کہے ۔ جب وہ پڑھ چکے تو شیخ یوں کہے کہ " تو نے بیعت کی مجھ ضعیف سے اور میرے شیخ سے اور
میرے شیخ کے مشائخ سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضرت رب العزت سے ۔
اور تو نے عہد کیا کہ اپنے اعضاء و جوارح کو شریعت کا پابند رکھے گا اور اپنے دل کو حق تعالیٰ شانہٗ
کی محبت کے لئے وقف کر دے گا " اُس وقت شیخ اپنا ہاتھ مرید کے داہنے ہاتھ پر رکھے ۔ یہ عمل
اِس آیۂ مبارکہ کے عین مطابق ہے :

یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ

اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

جو لوگ اس وقت گرد و پیش بیٹھے ہوں ان کو چاہیئے کہ اس طالب کا دامن تھام لیں۔ اگر مجلس میں زیادہ ہجوم ہو تو جس شخص نے طالب کا دامن پکڑا ہو اس کا دامن دوسرا شخص پکڑے۔ پھر اس کا دامن تیسرا شخص اور اسی طرح جتنے لوگ وہاں موجود ہوں کرتے چلے جائیں۔

اب مرید کہے کہ میں نے بیعت کی اور عہد کیا ہے کہ شریعت کی راہ پر چلوں گا اور میں نے اپنا دل اللہ کی محبت میں دے دیا ہے۔ اس کے بعد شیخ اس مرید کو خرقہ پہنا دے اور کہے:

ذالك لباس التقویٰ وذالك خیر والعاقبة للمتقین

پھر خلوت میں جو ذکر مرید کے مناسب حال ہو، اس کو تلقین کرے اور اس کی خبر کسی دوسرے کو نہ ہو۔

کسرہ: تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ ایک بار شیخ فرمائے اور مرید سنے۔ پھر مرید کہے اور شیخ سنے۔ اس طرح تین مرتبہ کرے اور حوالہ کر دے۔ یعنی شیخ کہے کہ جیسے مجھے اپنے پیران کبار سے پہنچا ہے، میں نے تجھے پہنچا دیا۔ مرید قبول کرے۔ پھر شیخ اس مرید کو مندرجہ ذیل امور کا حکم دے:

ہر نماز کے بعد دس بار درود شریف اور دس بار سورہ اخلاص پڑھنا۔ چھ رکعت نماز اوابین تین سلام کے ساتھ ادا کرنا۔ اس کے بعد حفظ ایمان کی نیت سے دو رکعت پڑھنا (اس کا طریقہ ہم نے اپنی کتاب "مرقع" میں بیان کیا ہے)۔ سونے سے پیشتر سو مرتبہ لا الہ الا اللہ پڑھنا اور ان کے علاوہ اپنے سلسلہ کے مشائخ قدس اسرارہم کے لئے فاتحہ پڑھتے رہنا۔

کسرہ: اذکار کو مراقبات پر مقدم رکھنا چاہیئے۔ بعض حضرات پہلے ہی دہلہ میں مراقبہ کا

حکم دیتے ہیں۔اگر مرید کی استعداد اس بات کا تقاضہ کرتی ہو تو یہ بھی روا ہے، بلکہ مرید جتنی محنت، کرے اتنا ہی بہتر ہے۔لیکن اولیٰ ترین صورت یہ ہے کہ طالب کو سب سے پہلے ذکر کے ساتھ رنگین کیا جائے اور اس کے اندر جوش و خروش پیدا کیا جائے۔اس کے بعد مراقبہ کی مدد سے اس کو بے رنگ بنایا جائے اور جوش و خروش کی جگہ اس میں خاموشی اور سکون کی کیفیت پیدا کی جائے۔لیکن اذکار میں بہت تفاوت ہے۔اگر شیخ کسی مرید کو دنیا کی طرف زیادہ متوجہ پائے تو اس کو سب سے پہلے نفی و اثبات کی تلقین کرے۔جس طالب میں عشق کی بُو باس ہو اسے اسم جلالی یعنی "اللہ" کی تعلیم دے۔اور جس کی طبیعت میں رقّت ہو، دل میں دنیا سے بے تعلقی اور اطلاق کی طرف میلان ہو تو ایسے مرید کو "ھُوْ" کی تلقین کرنی چاہیئے۔غرضیکہ ہر موقع اور محل کو دیکھنا ضروری ہے کیونکہ ہر کسی کے لئے ایک جداگانہ لائحہ عمل معین ہے جس کو انشا اللہ ہم اسی فصل میں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

ہمارے پیش نظر ان اوراق میں مراقبات و اذکار کی پوری تعداد قلمبند کرنا نہیں ہے۔جیسا کہ بعض کتابوں میں یہ ہزاروں کی تعداد میں مندرج ہیں۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان میں سے جن اذکار و مراقبات کو لب لباب یا مغز کی حیثیت حاصل ہے اور جنھیں صوفیائے عظام نے بطور خاص اختیار فرمایا ہے، ان کو یہاں بیان کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان مراتب علیا کا مالک ہوگا وہ جو کچھ ان سے نچلے درجے میں ہے اس کا بھی مالک ہوگا۔

تقمہ

خلوت کے لئے کوئی تنگ اور تاریک جگہ منتخب کرکے وہاں مربع (یعنی آلتی پالتی مار کر) بیٹھے۔ اس طرح بیٹھنا بدعت ہے اور یہ متکبروں کی نشست سمجھی جاتی ہے۔اگرچہ عام حالات میں اس کی ممانعت ہے تاہم ذکر میں اس طرح بیٹھنے کی اجازت ہے کیونکہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم جب نمازِ فجر سے فارغ ہوتے تو اسی جگہ مربع تشریف فرما ہو کر ذکر میں مشغول رہتے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جاتا۔

(ذکر کے لئے بیٹھنے کا طریقہ یہ ہے کہ) اپنی پشت کو بالکل سیدھا رکھے۔ آنکھیں بند اور دونوں ہاتھ زانوؤں پر ہوں۔ داہنے پاؤں کے انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی سے اپنے بائیں پاؤں کی رگِ کیماس کو زور سے پکڑے تاکہ قلب میں حرارت پیدا ہو۔ اس سے تصفیہ قلب ہوتا ہے۔ کیونکہ حرارت کے باعث، وہ چربی جو دل کے گرداگرد ہوتی ہے اور جسے خناس کا مسکن کہا گیا ہے، پگھل جاتی ہے۔ تو وسوسے اور ہواجس کم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یک دل و یک زبان ہو کر، جہر کے ساتھ یا آہستہ (جیسا بھی وقت یا طبیعت کا تقاضا ہو) ذکر میں مشغول ہو اور اس بیت کی شرائط کو ملحوظ رکھے۔

بزرخ وذات وصفات و مدّ و شد و تحت و فوق
می نماید عاشقاں را کلّ نفس ذوق وشوق

اس بیت کی شرائط کا ملحوظ رکھنا ذکر سہ پایہ میں بھی ضروری ہے۔ لیکن وہاں اس کے معنی کچھ اور ہیں۔ یہاں جو کچھ مقصود ہے وہ حسب ذیل ہے:

برزخ سے مُراد صورت شیخ ہے۔ ذات سے مُراد سبحانہٗ و تعالیٰ کا وجود مطلق ہے صفات سے مراد سات ائمہ صفات (یعنی حیات، علم، ارادہ، قدرت سماعت، بصارت اور کلام) ہیں۔ "مدّ" سے مُراد یہ ہے کہ "لَا اِلٰہ" کو کھینچ کر ادا کرے اور "شدّ" سے مُراد "اِلَّا اللہ" کی تشدید ہے۔ تحت سے مراد یہ ہے کہ "لا" کو بائیں زانو کے سرے سے شروع کر کے "الٰہ" کو داہنے کندھے تک لے جائے۔ اس جگہ (قدرے رک کر) اپنی سانس کو درست کرے۔ اب یہاں سے پوری قوت کے ساتھ فضائے دل پر "الا اللہ" کی ضرب لگائے، یہ فوق ہے۔

لقمہ — خطرات

خطرات چار قسم کے ہوتے ہیں :

۱۔ خطرۂ شیطانی۔ جو تکبّر، غضب، عداوت اور حسد وغیرہ کا موجب ہوتا ہے۔

۲۔ خطرۂ نفسانی۔ جو خواہش طعام، شہوت جماع، حرص، ذخیرہ اندوزی کی خواہش اور زیب و زینت کا موجب ہے۔

۳۔ خطرۂ ملکی۔ جو عبادات و طاعات اور دوسرے باعث ثواب امور کا موجب ہے۔

۴۔ خطرۂ رحمانی۔ جو اخلاص و محبت اور شوق وغیرہ کا موجب ہے۔

بائیں زانو کا سرا خطرۂ شیطانی کے دفع کرنے کا مقام ہے۔ کیونکہ بائیں جانب شیطان کی جائے قرار ہے۔

داہنے زانو کا سرا خطرۂ نفسانی کو دفع کرنے کا مقام ہے۔ کیونکہ بہکانے میں شیطان اور نفس کے درمیان ہمیشہ شراکت کے لئے مقابلہ رہتا ہے۔

داہنا کندھا خطرۂ ملکی کو دفع کرنے کا مقام ہے۔ کیونکہ یہ کاتب یمین ہے۔

دل کی فضا خطرۂ رحمانی کی قرار گاہ اور اس کے نصب کرنے کا مقام ہے۔

ان خطرات کی تفصیل کو ملحوظ خاطر رکھنے سے سالک کی طبیعت میں پریشانی اور حال میں پراگندگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا اسے امر کلی (جو ان سب کا جامع ہو) کی تلقین کرنا مناسب ہوگا۔ چنانچہ پہلے پہل اسے لا الہ الا اللہ تعلیم کریں۔ پھر لا معبود الا اللہ۔ پھر لا مقصود الا اللہ۔ پھر لا مطلوب الا اللہ اور پھر لا موجود الا اللہ پڑھنے کو کہیں۔ اس سے سارے خطرات

رفع ہو جائیں گے۔

اس ناچیز کی رائے میں سب سے پہلے "لاموجود الا اللہ" کی تلقین کرنا بہتر ہے کیونکہ سفر جتنا مختصر اور بوجھ جتنا کم ہو، اتنا ہی اچھا ہے۔ اگر مرید عجمی ہو تو اس کی اپنی بولی میں (ذکر) تلقین کریں۔

لقمہ ذکر دو ضربی

اس کی ایک ضرب "لا الٰہ" ہے جو داہنے کندھے پر اور دوسری "الا اللہ" ہے جو فضائے دل پر لگاتے ہیں۔ دونوں ضربیں پے در پے لگائی جاتی ہیں۔ تین یا پانچ یا سات یا نو بار لا الٰہ الا اللہ کہہ کر ایک بار محمد رسول اللہ کہنا چاہیئے۔

ذکر چہار ضربی کی نسبت اس ذکر میں چونکہ بساطت ہے اس وجہ سے اس ذکر میں تفرقہ کم ہے۔

لقمہ ترتیبِ ذکر

نفی و اثبات کے بعد اثبات اور اثبات کے بعد اسم ذات کہنا چاہیئے۔ "الا اللہ" سے "اللہ" اور "لا الٰہ الا اللہ" سے "الا اللہ" زیادہ کہنا چاہیئے۔

لقمہ ذکرِ لقلقہ

اس ذکر میں کلمہ "اللہ" کو متصلاً بغیر فصل کے اور آہستگی کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ ذکر

کرتے وقت منہ کو چاہے کھلا رکھے یا بند، دونوں طرح درست ہے بعض اس میں حبسِ نفس کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے۔

لقمہ ذکرِ سہ پایہ

یہ ذکر ابریق[1] سے مشابہہ ہے۔ ابریق میں تین پائے ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک پایہ نہ ہو تو وہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح اس ذکر کے تین ارکان ہیں۔ یعنی:

۱ - اسم ذات
۲ - ملاحظۂ سبعہ صفات۔
۳ - واسطہ۔ (جسے برزخ بھی کہتے ہیں)

اس ذکر کی سات شرائط ہیں۔ (جیساکہ اس بیت سے ظاہر ہے) ؎

برزخ و ذات و صفات و شد و مد و تحت و فوق
می نماید طالباں را کل نفس ذوق و شوق

یعنی یہ سات شرائط جن کا ذکر بیت کے مصرعۂ اولیٰ میں ہے، طالبوں کے اندر ہر دم ایک ذوق و شوق پیدا کرتی ہیں۔

"برزخ" سے مُراد واسطہ ہے، جیساکہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ "ذات" سے مُراد اسمِ ذات ہے یعنی "اللہ"، صفات سے امہات صفات یعنی علیم، سمیع، بصیر مراد ہیں۔ "شد" کا مطلب یہ ہے کہ لفظ "اللہ" کا تشدید پورے طور پر ادا کیا جائے اور "مد" کا معنیٰ یہ ہے کہ "اللہ" کے الف کو خوب طول دے کر پڑھا جائے۔ "تحت" یہ ہے کہ ہمزۂ "اللہ" کو پوری

---

[1] ایک قسم کا ٹونٹی دار لوٹا جس کے پیندے کے نیچے تین پائے بنے ہوتے ہیں۔

قوت کے ساتھ ناف کے نیچے سے شروع کرے اور "فوق" سے مراد یہ ہے کہ (ہمزۂ اللہ کو دماغ میں لے جاکر ختم کرے۔

چونکہ اس ذکر کو حبس دم کے بغیر نہیں کیا جاتا اس لئے بطور شرط بیعت مذکورہ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہمزہ "اللہ" کو پوری قوت کے ساتھ ناف کے نیچے سے کھینچے اور تمام سانس سینہ بھر کر روک لے۔ اور دل میں اللہ کہے۔ اس کے ساتھ ساتھ "سمیع" کہے اور اس کے معنی کا تصور کرے۔ پھر اسی طرح دل میں "اللہ" کہے اور اس کے ساتھ "بصیر" کہے اور اس کے معنی کا تصور کرے۔ علیٰ ہذا القیاس "علیم" کہے۔ اس کو "عروج" کہتے ہیں۔ اب اسی طریقے سے پہلے علیم پھر بصیر پھر سمیع کہے۔ اس کو "نزول" کہا جاتا ہے۔ اب پھر سمیع، پھر بصیر اور پھر علیم کہے۔ یہ "عروج ثانی" کہلاتا ہے۔ اس میں راز یہ ہے کہ سمیع کا احاطہ بصیر کے احاطہ سے کمتر ہے! ور بصیر کا احاطہ علیم کے احاطہ سے کمتر ہے۔ سالک آغاز حال میں عقل و شہادت کے مرتبہ میں ہوتا ہے۔ یہ تمام مراتب میں تنگ ترین مرتبہ ہے۔ لہٰذا سمیع کو مقدم رکھے۔ جب اس سے ترقی کر کے آگے بڑھا تو "مرتبۂ غیب" میں پہنچا جو ایک وسیع تر مرتبہ ہے۔ لہٰذا اب بصیر کو مقدم کرے۔ جب یہاں سے بھی آگے "مرتبۂ غیب الغیب" میں پہنچے جو پچھلے دونوں مراتب سے کہیں زیادہ وسیع ہے، تو اب "علیم" کا تصور رکھے اور پھر اس کے بعد واپس لوٹے۔

ترتیب یاد رہے:

اللہ سمیع	اللہ بصیر	اللہ علیم
اللہ علیم	اللہ بصیر	اللہ سمیع
اللہ سمیع	اللہ بصیر	اللہ علیم

یعنی یہ ایک ذکر ہے۔ اس میں دو عروج ہیں اور ان دونوں کے درمیان ایک نزول ہے۔ حبس دم اتنا ہو کہ اس میں سالک اس ذکر کو دو یا تین بار سے لے کر ڈھائی سو بار تک کر سکے تاکہ اس سے سالک کے باطن میں ایک حرارت پیدا ہو جس سے وہ باطنی دسومات (یعنی چربی) جل

جائیں جو وسوسہ انگیز خناس کا مسکن ہیں اور خطرات کی بندش ہو کر محویت غالب آجائے۔

تحت میں جہاں بہت سے فوائد ہیں وہاں بے شمار تنگیاں بھی ہیں۔ لیکن ذکر بغیر تحت کے ناقص رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے بغیر چارہ نہیں۔ پھر بھی ذاکر کو چاہیئے کہ خود کو زیادہ حرج میں ڈالے بغیر "تحت" کو کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی حفاظت اور امان کا طلب گار رہے۔

• ذکر سہ پایہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ مربع بیٹھ کر داہنے پاؤں کے انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی سے بائیں پاؤں کی رگ کیماس کو خوب مضبوطی کے ساتھ پکڑ لے۔ ناف کو اندر کھینچ کر ذرا نیچے سے اوپر کی طرف اٹھائے۔ دونوں آنکھوں کو بند رکھے اور شیخ کی صورت کو دل میں حاضر کرے۔ اور اسم مبارک "اللہ" کو پوری شدت کے ساتھ ناف کے نیچے سے اوپر کی طرف کھینچے۔ "اللہ" کے دوسرے لام کو بہت طول دے اور اس لفظ کے ساتھ سمیع، پھر بصیر، پھر علیم کا ملاحظہ کرے۔ مشائخ کی کتابوں میں اسے نزول کہا گیا ہے۔ لیکن فقیر کے نزدیک مختار وہی ہے جو اوپر آچکا ہے اور اس کا سبب بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ جب کوشش کرتے کرتے یہاں تک ہو جائے کہ ایک سانس میں ڈھائی سو بار اسم "اللہ" تینوں دوسرے اسمأ کے ساتھ مذکورہ شرائط کے مطابق ادا کرنے لگے تو ان تینوں صفات کے ساتھ پانچ اور صفات یعنی؛

دائم۔ قائم۔ حاضر۔ ناظر۔ شاہد

بھی ملالے۔ جب اس کا شمار بھی عروج و نزول کے ساتھ ایک سانس میں ڈھائی سو تک پہنچ جائے اور سالک ان میں سے ہر ایک کے انوار سے بہرہ یاب ہونے لگے تو ان کے ساتھ سات اور صفات (جنھیں سات امام بھی کہتے ہیں) ملالے۔ جب اس میں استقامت حاصل ہو جائے تو اب صفاتِ مرکبہ کا اضافہ کرتا چلا جائے۔ مثلاً

اکرم الاکرمین، ارحم الراحمین، اجود الاجودین

ذوالفضل العظیم و رب العرش العظیم۔

لقمہ — سلسلہ شطاریہ میں ذکر کا طریقہ

سلسلہ شطاریہ کے دستور کے مطابق اسم ذات زبان سے یا دل میں لے اور اسمائے صفات — یعنی سمیع، بصیر، علیم — کو خیال میں جمالے۔ پھر برزخ شیخ کو نظر کے سامنے رکھ کر مدد و شد کرے، اس طرح کہ زیر ناف اس کا آغاز کر کے تالو تک پہنچائے۔ محاربۂ صغیر میں ایک سانس میں ایک بار اور محاربۂ کبیر میں ایک سانس میں سو بار یہ ذکر کیا کرے۔ جب ان صفات کو شروع کرے۔ عروج و نزول کی رعایت کو ملحوظ رکھے۔ محاربۂ کبیر میں پوری قوت سے حبس دم کرے اور صورتِ شیخ کا تصور جما کر ذکر کرے یہاں تک کہ بیخود و بے ہوش ہو جائے۔ وہ مقصود جو بہت بھوکا اور بیدار رہنے سے کہیں ہاتھ لگتا ہے، اس ذکر سے تھوڑے عرصہ میں حاصل ہو جاتا ہے۔

لقمہ — ذکر شش ضربی و چہار ضربی

اللہ کے اس ذکر کو شش ضربی اور چہار ضربی کہتے ہیں۔ شش ضربی تو یہ ہے کہ ہر چھ جہت میں ایک ایک ضرب لگائے۔ اور چہار ضربی یہ ہے کہ قبلہ رُو بیٹھ کر اپنے آگے مصحف یا کسی بزرگ کی قبر رکھے۔ پہلی ضرب بائیں جانب دوسری دائیں جانب، تیسری مصحف (یا قبر) پر اور چوتھی ضرب دل پر مارے۔ اس سے ذکر میں استغراق حاصل ہوگا اور قرآن کے معانی یا اہل قبور کے احوال منکشف ہوں گے۔ لیکن اس میں صورتِ شیخ کا تصور بہت ضروری ہے ورنہ کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

لقمہ ذکرِ حدّادی

کلمہ "لاالہ" کو مد اور تصور شیخ کے ساتھ بائیں جانب سے شروع کرے اور دونوں گھٹنوں کے بل کھڑا ہو جائے اور پھر کلمہ "الااللہ" کو پوری قوت اور شدت کے ساتھ فضائے دل پر مارے اور بیٹھ جائے اس ذکر کو اس طرح کرے جیسے لوہار ہتھوڑے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر پورے زور سے لوہے پر مارتا ہے۔ اسی طرح کرتا جائے یہاں تک کہ ذوق ملنے لگے۔ یہ ذکر حضرت ابوحفص حداد علیہ الرحمہ سے منقول ہے اور اس میں مشقت بہت ہے۔

لقمہ پاس انفاس (ذکرِ لاالہ الااللہ)

کلمہ "لاالہ" کو سانس کے ساتھ باہر نکالے اور کلمہ "الااللہ" کو سانس کے ساتھ اوپر کھینچے۔ پس سانس کی آمد و رفت کے ساتھ ذکر کرتا جائے اور بست و کشاد میں نظر ہمیشہ ناف پر رکھے۔ اتنا ذکر کرے کہ سوتے جاگتے ذاکر کا دم ذاکر ہو جائے۔ اس ذکر سے ذاکر کی عمر دوگنی ہو جاتی ہے۔

لقمہ پاس انفاس (ذکرِ "اللہ")

کبھی پاس انفاس لفظ "اللہ" کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ "اللہ" کی "ہا" کو پیش کے ساتھ ادا کرتے ہیں اس طرح کہ اس میں "واو" پیدا ہو جاتا ہے (ہُو) اور سانس کو کھینچتے وقت "اللہ" کو سانس کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ گویا سانس دل کی زبان بن جاتی ہے ایسی

طرح جب سانس کو چھوڑتے ہیں تو "ہُو" کو سانس کے ساتھ کہتے ہیں۔

پاس انفاس میں چاہے ذکر "اللہ" کریں چاہے ذکر "لا الہ الا اللہ"، دونوں برابر ہیں۔ اگر ذکر کرتے ہوئے نتھنوں سے آواز پیدا ہو تو اسے "ناک کا آرہ" کہتے ہیں۔ اس سے بہت شورش و سوزش اور دماغ میں حرارت و خشکی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ناک کو روغن بادام سے چپڑتے رہنا چاہیئے اور سر پر اس کی مالش کرنی چاہیئے۔

اس ذکر کو کمال تک پہنچانا ضروری ہے اور کمال یہ ہے کہ ذاکر کے شعور یا اختیار کے بغیر اس کا دم ذاکر رہے۔

لقمہ۔ ذکر سینہ بہ سینہ

کسی ایسے شخص کو جس کی لوحِ دل پر ابھی کسی ذکر و فکر کا نقش نہ بنا ہو، پیر و مرشد اپنے روبرو، گھٹنوں کے ساتھ گھٹنے ملا کر بٹھائے نشست کا انداز یہ ہو کہ مرید کی ٹھوڑی اس کے سینہ پر ٹکی ہو، کمر اندر کی طرف خم ہو اور سینہ باہر نکلا ہوا ہو اور دونوں آنکھیں بند ہوں۔ اب شیخ اس مرید کی سانس کی آمد و رفت کو دریافت کرے۔ جب وہ اپنی سانس اندر کھینچے تو شیخ اپنی سانس کو اس کی سانس پر چھوڑ دے۔ جب اس کی سانس باہر نکلے تو شیخ اپنی سانس اندر کھینچے۔ ایسا کرتے کرتے یکایک مرید میں ایک شورش پیدا ہو گی اور ذکر "لا الہ الا اللہ" یا ذکر "اللہ" (ان میں سے جو بھی مقام مرشد کا غالب ہوا) مرید کی زبان اور سانس سے جاری ہو گا۔ لوگوں کو اس سے حیرت ہو گی۔ اس ذکر کا اسقدر غلبہ ہو گا کہ اس کی حرارت سے مرید کے ناک، کان سے خون بہہ نکلے گا۔ اسے سینہ بہ سینہ کہتے ہیں کیونکہ اس کی تعلیم بلا واسطۂ زبان ہوتی ہے۔ لیکن اگر مرید خود شاغل ہے اور بالخصوص مراقبہ کا شاغل جس میں حبس دم کیا جاتا ہے تو اس صورت میں پیر و مرشد کی یہ تدبیر کارگر نہ ہو گی کیونکہ اس نے حبس دم کر لیا ہے۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس

کی بیخودی مرشد پر اس حد تک اثر انداز ہو جائے کہ وہ فکر تدبیر ہی سے معطل ہو جائے ۔ خود میرے ساتھ ایک مجلس میں ایسا واقعہ پیش آچکا ہے جس سے مجلس کی صورت ہی برعکس ہو گئی تھی ۔

لقمہ ذکر کشف الروح

کوئی روح ہو کسی جگہ ہو، اس ذکر سے وہ ضرور حاضر ہو گی۔ پہلے اکیس مرتبہ "یا روح الروح" کہے اور دل پر ضرب لگائے۔ پھر سر اٹھا کر "یا روح ماشاء اللہ" کہے جب ذکر سے فارغ ہو تو مطلوب کی طرف متوجہ ہو۔ خواب یا بیداری میں وہ روح حاضر ہو جائے گی۔

اگر یہ کلمات دو ہزار بار کہے تو بہت جلد مقصود ہاتھ آئے گا۔ سید گیسو دراز علیہ الرحمہ نے حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی قدس سرہٗ سے یہ ذکر سیکھا ہے ۔

لقمہ اختصار ذکر کلمہ طیبہ

بعض لوگ کلمہ طیبہ کا اختصار کرتے ہیں اور :

هَ ، هُ ، هِ

کہہ کر پہلی ضرب داہنی جانب ، دوسری بائیں جانب اور تیسری دل پر لگاتے ہیں۔

لقمہ ذکر کشف القبور

قبر کے پاس بیٹھ کر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر "اِکْشِفْ لِیْ یَا نُوْرُ" کہے اور دل پر ضرب لگائے پھر "اِکْشِفْ لِیْ" کہہ کر میت کے چہرے کے مقابل میں قبر پر ضرب لگائے اور کہے

"عَنْ حَالِہٖ"

اِس ذکر سے علانیہ یا خواب میں اس میت کا حال معلوم ہو جائے گا۔

لقمہ ذکر اجابت الدعوات

پہلے "یارب"، کہہ کر داہنی بغل پر ضرب لگائے۔ پھر "یارب"، کہہ کر بائیں بغل پر ضرب لگائے، پھر "یارب"، کہہ کر دل پر ضرب لگائے اور آخر میں کہے "یاربی"، اسی طرح کرتا جائے۔ اس ذکر کو کثرت سے کرنا چاہیئے۔ جب ختم کرنے کا ارادہ ہو تو دونوں ہاتھ اٹھا کر "یاربی"، کہے اور ہاتھوں کو منہ پر پھیرے اور جو مقصود ہو اُسے دل میں حاضر رکھے۔

یہ ذکر شیخ الحقیقت، شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ سے منقول ہے۔

لقمہ سلسلہ نقشبندیہ میں ذکر کا طریقہ

زبان کو تالو کے ساتھ چپکا کر حبس دم کرے اور کلمہ "لا" کو ناف سے شروع کرکے دماغ کی طرف لے جائے۔ پھر کلمہ "الٰہ"، کے ساتھ داہنے کندھے کی طرف مائل ہو اور وہاں سے "الا اللہ"، کہتے ہوئے بائیں طرف جائے اور فضائے دل پر ایسی قوی ضرب لگائے جس کا اثر پورے جسم میں ظاہر ہو۔ اگر اس ذکر کی شکل بنائی جائے تو وہ حسب ذیل ہو گی:

یہ صورت کلمہ "لا" کی ہے۔ لہٰذا اس ذکر کی صورت کی موافقت میں خود کو نیست اور حق کو ثابت کرے اور زبانِ قلب سے کہے:

اِلٰہِی اَنْتَ مَقْصُوْدِیْ وَرِضَاکَ مَطْلُوْبِیْ

(اے اللہ تو میرا مقصود ہے اور تیری رضا میرا مطلوب)

اس نفی و اثبات میں سالک کے ظاہر میں کوئی حرکت محسوس نہیں ہونی چاہیئے۔ حبسِ دم کے ساتھ یہ ذکر متواتر جاری رکھے۔ جب حبس دم کو ختم کرنے لگے تو بزبانِ قلب "محمد رسول اللہ" کہے۔

اس ذکر کی تاثیر یہ ہے کہ ذاکر نفی سے خود منفی اور اثبات سے ثابت ہو جاتا ہے۔ مگر ذکر کا شمار اکیس سے متجاوز ہو جائے اور اس کے باوجود سالک پر اس کا کوئی اثر مرتب نہ ہو اور محویت و بیخودی حاصل نہ ہو تو اسے چاہیئے کہ پھر سے شروع کرے۔ یقیناً اس سے کسی شرط کی بجا آوری میں چوک ہوگئی ہے ورنہ یہ ذکر اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا۔

لقمہ — نفی اور اثبات

نفی اثبات دو ضربی یا چار ضربی اس طرح شروع کرے کہ داہنی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور بائیں طرف اپنے شیخ کا اور دل کے سامنے حق تعالیٰ کا تصور کرے۔

بعض کے نزدیک روبرو، ما بین الطرفین حضرت وجودِ مطلق کو تصور کرے۔

لقمہ — ذکر برائے دفعِ مرض

"یا احد" داہنی جانب، "یا صمد" بائیں طرف اور "یا وتر" دل پر کہے۔

لقمہ ذکر اجابت الدعوات

عشاء کے بعد نفل سے فارغ ہوکر ستر بار " یا وہاب " کہے۔ اس سے دنیاوی حاجات پوری ہوں گی۔ اس کے بعد دو رکعت نماز پڑھے۔ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد گیارہ ۱۱ مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھے۔

لقمہ چلتے پھرتے ذکر کرنا

اگر جلدی جلدی چلے تو ہر قدم پر " الا اللہ، الا اللہ " کہے۔ اگر آہستہ چلے تو داہنا قدم اٹھاتے وقت " لا " اور بایاں قدم اٹھاتے وقت " الٰہ " کہے۔ پھر داہنے پر " الا " اور بائیں پر " اللہ " کہے۔

اگر متوسط رفتار سے چلے تو ہر قدم پر " اللہ، اللہ " کہنا جائے۔

لقمہ ذکرِ ناسوتی وملکوتی وجبروتی ولاہوتی

مجموعی کلمہ " لاالہ الا اللہ " ذکر ناسوتی ہے۔ " الا اللہ " ذکر ملکوتی ہے۔ " اللہ " ذکر جبروتی ہے اور " ہُو " ذکر لاہوتی ہے۔

لقمہ اذکار — جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے ہیں

ہم یہاں چند اذکار درج کر رہے ہیں جو ہم تک سینہ بہ سینہ پہنچے ہیں۔ یہ اذکار مریدین کو ان کے اواخرِ حال میں، جب کہ وہ ریاضات و مجاہدات اور چلّہ کشی کے مراحل سے گزر کر مکمل تصفیہ حاصل کر چکے ہوتے ہیں، تلقین کئے جاتے ہیں۔ اب ہم ہر ذکر کی تفصیل بیان کریں گے۔

ذکرِ معیت جب مشاہدۂ ذاتی وصفاتی میں کمی ہو تو اس صورت میں یَامَعِیْ یَامَعِیْ یَامَعِیْ۔ یَاھُوْ۔ یَاھُوْ۔ یَاھُوْ تعلیم کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قعدۂ نماز کی نشست اختیار کرے اس طرح کہ دونوں پاؤں سرین سے باہر نکلے رہیں اور سرین زمین پر رکھے۔ داہنے ہاتھ سے بایاں بازو اور بائیں ہاتھ سے داہنا بازو خوب زور سے پکڑے اور پانچ ضرب سے ان کلمات کو کہے۔ پہلی ضرب داہنے قدم اور داہنے زانو کے درمیان اور دوسری آسمان کی طرف۔ تیسری ضرب بائیں قدم اور بائیں زانو کے درمیان۔ چوتھی ضرب جگر پر اور پانچویں ضرب فضائے دل پر پوری قوت اور شدت کے ساتھ لگائے اور خیال کرے کہ "ھُوْ" سے مراد احدیت مطلقہ ہے جس کا کوئی مثل نہیں ہے۔

اس ذکر کے دنوں میں دودھ کا استعمال رکھنا چاہیئے۔ اگر اس میں زعفران ملا لیا جائے تو اور بھی اچھا ہے۔ عطریات کا بھی استعمال کثرت سے کرنا چاہیئے۔

بعض اوقات اس ذکر کو صرف تین کلمات —— یعنی ھُوْ۔ ھُوْ۔ یَامَعِیْ —— تک ہی محدود رکھتے ہیں، اس کی نشست حسب سابق ہے فرق اتنا ہے کہ "ھُوْ۔ ھُوْ" کی ضرب آسمان کی طرف اور "یَامَعِیْ" کی ضرب دل پر کرتے ہیں۔

ذکرِ کلیہ یہ ذکر اس طرح سے ہے:
بِكَ الكُلُّ ، مِنكَ الكل ، اليكَ الكل ، يا كل الكل

اور ایک جگہ ہم نے یوں بھی دیکھا ہے:

اللھم انت الکل ومنک الکل وبک الکل ولک الکل والیک الکل وکل الکل۔

اس ذکر سے ذات اور صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آگے ایک ضرب پھر داہنے ایک ضرب اور پھر آسمان کی طرف یا دل پر ایک ضرب۔

ذکر احاطہ یہ ذکر اس طرح ہے:

یَا محیط ظھرًا و بطنًا

ذکر مشاہدہ کا باعث ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ظھرًا کہتے وقت آنکھیں کھولے اور بطنًا کہتے وقت ان کو بند کرے۔

ذکر محو الجہات اس طرح سے ہے:

انت فوقی۔ انت تحتی۔ انت امامی۔ انت خلفی۔ انت یمینی۔ انت شمالی

انت فی وانا مع الجہات فیک اینما تولوا فثم وجہ اللہ۔

طریقہ اس کا یہ ہے کہ کھڑے ہو کر عرش کی طرف منہ کرے اور "انت فوقی" کہے پھر زمین کی طرف دیکھے اور بیٹھ کر "انت تحتی" کہے پھر سامنے کو چہرہ کر کے "انت امامی" کہے پھر پیچھے پھر کر "انت خلفی" کہے۔ اسی طرح دائیں طرف "انت یمینی" اور بائیں طرف "انت شمالی" کہے۔ پھر دل پر ضرب لگا کر "انت فی" کہے اور اٹھ کر گھومتے ہوئے "انا مع الجہات فیک اینما تولوا فثم وجہ اللہ" کہے۔

ذکر تجلی انانیت تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر سو مرتبہ "انی انا اللہ لا الٰہ الا انا" کہے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ آسمان کی طرف سر اٹھا کر "انی انا اللہ" کہے پھر داہنی جانب سر کو پھیر کر "لاالٰہ" کہے اور پھر فضائے دل پر ضرب شدید لگا کر "الا انا" کہے۔

ان پانچوں اذکار میں جو ہم نے اوپر درج کئے ہیں، تصورِ معانی اور تصورِ برزخ شرط ہے۔

حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر قدس سرہٗ العزیز نے پنجابی زبان میں ذکر تلقین فرمایا ہے جو حسب ذیل ہے :

اُہوں توں (علویات کی طرف اشارہ)

اِہوں توں (سفلیات کی طرف اشارہ)

توہیں توں (اطلاق کی طرف اشارہ)

مجلس ذکر جب ختم ہو تو تین بار یوں کہے :

سبحان اللہ وبحمدہٖ، سبحان اللہ العظیم

اور اس کے بعد یہ دُعا پڑھے :

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ قُلْتَ فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ وَقَدْ

اے اللہ تو نے فرمایا ہے کہ تم میرا ذکر کرو میں بھی تمہارا ذکر کروں گا اور میں نے

ذَکَرْتُکَ عَلٰی قَدَرِ قِلَّتِ عِلْمِیْ وَعَقْلِیْ وَ فَھْمِیْ

تیرا ذکر کیا ہے اپنے قلیل علم و عقل اور فہم کے مطابق ۔

فَاذْکُرْنِیْ عَلٰی قَدَرِ سَعَةِ نَفْسِكَ وَفَضْلِكَ وَ

پس تو بھی میرا ذکر فرما اپنے نفس کی اور اپنے فضل علم

عِلْمِكَ وَ مَغْفِرَتِكَ ۰ اَللّٰھُمَّ افْتَحْ مَسَامِعَ قُلُوْبِنَا

اور مغفرت کی وسعت کے مطابق ۔ اے اللہ! ہمارے دلوں کے کانوں کو

بِذِکْرِكَ یَا خَیْرَ الذَّاکِرِیْنَ ۔

اپنے ذکر کے لئے کھول دے ۔ اے سب سے بہتر ذکر کرنے والے ۔

وصل دوم

مراقبہ کا معنیٰ ہے اپنے دل کی اس طرح نگہبانی کرنا کہ اس میں غیراللہ ہرگز نہ آنے پائے۔
یاد رکھو کہ دل کا وہ مرض جسے غیر حق کے ساتھ مشغول ہونا کہا جاتا ہے، اس کا باعث تین چیزیں ہیں :

"حدیث نفس" یہ خلوت ہو یا جلوت ہمیشہ قصد و اختیار سے دل میں آتی ہے۔

"خطرہ" دل میں بغیر قصد و ارادہ کے آتا اور جاتا رہتا ہے۔

"نظر بہ غیر" یعنی اشیائے متکثرہ کا علم۔

اس مرض کا اصل علاج یہ ہے کہ اپنے باطن کو مشغول حق رکھا جائے شغل باطنی کی کئی قسمیں ہیں۔

حدیث نفس کی بجائے اسم اعظم کو (جو اسم ذات ہے) قائم کرو۔
خطرہ کی جگہ اسمائے صفات امہات[1] کو رکھو
دل کی نگاہ جمال مرشد پر جماؤ کہ اسی کو واسطہ، رابطہ اور برزخ کہتے ہیں۔

لقمہ فناء

معنئ مقدس کے ملاحظہ سے مُراد یہ ہے کہ اسم ذات کو کسی عبارت کی قید کے بغیر یا بلا تخصیص کسی لغوی مفہوم کے، اپنے ذہن یا علم میں ملاحظہ کیا جائے اور قلب صنوبری کی جانب مکمل طور پر توجہ رہے۔ اس کام کے لئے ایک روشن ذہن اور پرکھنے والی طبیعت درکار ہے۔ اگر (سالک کو) یہ معنی مقدس ذہن نشین نہ ہوں تو اسے چاہیئے کہ وہ (معنی مقدس کو) ایک نور خالص تصور کرے اور اپنے آپ کو اس نور میں معدوم اور منتشر خیال کرے۔ گویا نور کا ایک بحر بے کنار ہے اور وہ اس میں ایک قطرے کی مانند ہے۔ یا اس معنی مقدس کو ظلمتِ خالص (یعنی انتہاء تاریکی) اور اپنے آپ کو ایک مخصوص سایہ تصور کرے۔ سایہ جب تاریکی میں آتا ہے تو وہ معدوم ہو جاتا ہے یعنی سائے اور تاریکی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔

لقمہ لطیفہ قلبی

بعض عارفوں نے شغل کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ مرید اپنے شیخ کی صورت کو اپنے خیال میں حاضر کرے یہاں تک کہ وہ حرارت اور کیفیت جو اہل شغل کے لئے مخصوص ہے، اس کے اثرات

---

[1] :۔ صفات امہات: حیات، علم، ارادہ، قدرت، سماعت، بصارت، کلام۔ انھیں سبعہ صفات بھی کہتے ہیں۔

مرید کے وجود میں ظاہر ہونے لگیں۔ اب اس کیفیت کے ساتھ جو مرید کو صورتِ شیخ کے تصور سے حاصل ہوئی ہے، وہ اپنی حقیقتِ جامعۂ انسانیہ کی طرف متوجہ ہو یعنی اپنی حقیقتِ جامعہ کو شیخ کی صورت بنا کر اسے اپنا شیخ تصور کرے۔ لیکن یہ حقیقتِ جامعہ جسے اصطلاحاً قلب کہتے ہیں چونکہ اجسام میں حلول نہیں کرسکتی اس لیے اس کا حاضر کرنا ذرا دشوار کام ہے۔ اس دشواری کا حل یہ ہے کہ مرید اپنے قلب صنوبری کی طرف، جسے "مضغہ" کہتے ہیں، متوجہ ہو۔ یہ توجہ ایسی ہونی چاہیئے کہ مرید کے جملہ حواس یکسو ہو جائیں۔ کیونکہ قلب حقیقی کا قلب مجازی کے ساتھ ایک ایسا ارتباط ہے جو اعضاء کے ساتھ نہیں ہے۔ بلاشبہ اس حالت میں مرید پر غیبت اور بے خودی طاری ہوگی۔ اس غیبت و بیخودی کو ایک ایسی راہ مستقیم سمجھنا چاہیئے جس میں ذرا برابر کجی نہ ہو۔ سالک کو یہ تصور کرنا چاہیئے کہ وہ اس راہ پر چلا جا رہا ہے۔ یہ راستہ غیر متناہی ہے۔

لقمہ "خطرات" سے نجات پانا

اگر کوئی خطرہ یا وسوسہ (سالک کے) پیچھے لگ جائے اور وہ اس سے گریزاں ہو تو دو[۲] صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ (اس دوڑ میں) وہ خطرہ پیچھے رہ جائے گا اور سالک کا تعاقب چھوڑ دے گا۔ دوسری یہ کہ وہ اسے آدبوچے گا۔ اگر خطرہ سے پیچھا چھوٹ جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے سالک کو چاہیئے کہ حقیقت جامعہ ــــــــ جسے مرید نے صورتِ مرشد میں پا لیا ہے ــــــــ کی طرف متوجہ ہو اور کوشش کرے کہ یہ حالت تا دیر رہے۔ اگر اس طریقہ سے خطرہ دور نہ ہو تو پھر دماغ کا تخلیہ کرے، یعنی سانس کو زور کے ساتھ ناک کے راستے خارج کرے اور پھر (اسی حقیقت جامعہ کی طرف) متوجہ ہو۔ اب یہ کامیابی نہ ہو تو مندرجہ ذیل استغفار بکثرت کرے:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ مِنْ جَمِيْعِ مَا كَرِهَ اللّٰهُ
قَوْلاً وَفِعْلاً وَحَاضِراً وَغَائِباً وَسَامِعاً وَنَاظِراً وَلاَ

حَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِیْمِ ۔

استغفار کرتے وقت مرید کے دل اور زبان میں پوری موافقت ہونی چاہئیے۔ اس سے بات نہ بنے تو اسم یَا فَعَّالُ کا وظیفہ کرے۔ وظیفہ کرتے وقت اس اسم مبارک کا مفہوم ذہن میں رہے۔ وسواس کو دفع کرنے میں یہ ایک خاصیت رکھتا ہے۔ اگر اب بھی خطرہ دور نہ ہو تو لا الہ الا اللہ کے معنی میں غور کرنے یعنی لا موجود الا اللہ۔ اس سے بھی فائدہ نہ ہو تو نہایت شدومد کے ساتھ، بآواز بلند، "اللہ" کہہ کر اپنے قلبِ صنوبری پر ضرب لگائے۔

لقمہ ، مقامِ حیرت

حواس خمسہ ظاہری اور باطنی کے احاطۂ ادراک میں جو کچھ آتا ہے وہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا وہ مطابقِ واقع ہے، لہٰذا حق ہے۔ یا وہ مطابقِ واقع نہیں، اس لئے باطل ہے۔ جو حضرات وحدۃ الوجود کے قائل ہیں ان کے نزدیک یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ "حق" کی طرح باطل بھی اللہ تعالیٰ کے مظاہر میں سے ہے

چنانچہ شیخ ابو مدین مغربی علیہ الرحمہ، جو شیخ محی الدین عربی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد تھے، فرماتے ہیں:

لا تنکر الباطل فی اطوارہ ۔۔۔ فانہ بعض ظہوراتہ
واعطہ منک بمقدارہ ۔۔۔ حتی توفی حق اثباتہ

باطل کا، اس کے اطوار میں، انکار نہ کرو کیونکہ وہ بھی اس کے بعض مظاہر میں سے ہے
اور حتی المقدور اس کا حق ادا کرو۔ یہاں تک کہ اس کے اثبات کا حق تم سے ادا ہو جاتے

اور ان اشعار کے تتمہ میں حضرت موید الدین الجندی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں :

فالحق قد یظہر فی صورتہ   و ینکر الجاھل فی ذاتہ

حق کبھی اس کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ، اور جاہل اس کی ذات میں انکار کرتے ہیں ۔

لہٰذا کلیات اور جزئیات میں جو کچھ نفس کے ادراک میں آئے اس میں وجودِ مطلق کا مطالعہ کرنا چاہیئے (اور جاننا چاہیئے کہ یہاں وجود مطلق) ایک خاص شان کے ساتھ ظاہر ہوا ہے ۔ خطرات کے سد باب کا یہ سب سے عمدہ طریقہ ہے ۔ اس سے بلاشبہ ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس میں (ماسویٰ) غائب ہو جاتا ہے ۔ ایک خاص ذوقی حالت میسر آتی ہے ۔ اور مراتب کونی و الٰہی کا ادراک ہونے لگتا ہے ، بہتر ہے کہ "مطالعہ" کی بھی نفی کر دائی جائے اور اس کیفیت غیبیہ کو قائم کر کرلیا جائے اور نفس کو چھوڑ کر بیخودی و بے ہوشی کا دامن مضبوطی سے تھام لیا جائے ، کیونکہ اس راہ کے محققین کے نزدیک غیبت سے باہر آنا کفر کے مترادف ہے اگرچہ اس کا مقصد حقائق پر غور و فکر یا علمی و عملی باریکیوں کا تدبر ہی کیوں نہ ہو ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غیبت و بے خودی سالک کو اس وادی کی طرف لے جاتی ہے جس کا نام "حیرت" ہے ۔ اور حیرت آخری مقام ہے ۔

تتمہ   مرتبہ جمع الجمع

سالک کو چاہیئے کہ دل کی آنکھ سے اپنی حقیقت کو ، جسے "حقیقتِ جامعہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے ، دیکھے اور جملہ احوال و افعال میں اس حقیقت کو چشمِ دل کے سامنے رکھے تب وہ جملہ موجودات میں ، خواہ وہ حسنہ ہوں یا قبیح ، لطیف ہوں یا کثیف ، محسوس ہوں یا غیر محسوس ، اپنی حقیقتِ جامعہ کو جاری و ساری دیکھے گا ۔ یہاں تک کہ اسے مشاہدہ حاصل ہو جائے گا کہ تمام عوالم اسی سے قائم ہیں اور وہ تمام موجودات میں سرایت کئے ہوئے ہے ۔ جتنے محسوسات و معقولات ہیں سب

اس کے لئے آئینہ کی مانند ہوں گے جن میں وہ اپنی حقیقتِ جامعہ کا ملاحظہ کرے گا یا یوں کہو کہ سارے عوالم بمنزلہ ایک جسم کے ہوں گے اور سالک اس جسم میں بمنزلہ روح کے ہوگا۔ اس مرتبہ کو "جمع الجمع" کہتے ہیں۔ جب یہ مراقبہ قوی ہو جائے تو جو کچھ تمام عوالم میں واقع ہو رہا ہے، خواہ وہ شادی ہو یا غمی، سالک ان سب واقعات سے آگاہ ہوگا۔ کیونکہ روح کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے جسم کے رنج و راحت سے مطلع رہے۔

طالب کو چاہیئے کہ "لا الہ الا اللہ" یا فقط اسم "اللہ" کی مکتوبی صورت کو کسی کاغذ پر لکھ کر اسے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھے یا چشمِ باطن سے اپنی لوحِ خیال یا اپنے صفحۂ علم پر اس نقش کا مطالعہ کرے۔ طالب کو بڑی پابندی کے ساتھ اس ہیئت (یعنی کلمہ کی صورت کتابی) کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے یہاں تک کہ اس پر غیبت طاری ہو جائے اور وہ ہیئت اسے مکمل طور پر فراموش ہو جائے بلکہ اس کے فراموش ہو جانے کا علم بھی اسے نہ رہے۔

لقمہ بیخودی

کسی پتھر یا کلوخ یا قبر یا مصحف یا پھول کی طرف، یا شیخ یا معشوق کے چہرے کی طرف، یا کسی اور شئے کی طرف اپنی آنکھوں کو اور نگاہ کو اس طرح جمائے کہ پلک نہ جھپکے اور اپنے قوائے باطنی کو بھی حقیقتِ مطلقہ غیر مکیفہ[1] کی طرف متوجہ کرے، یہاں تک کہ خطرات کے راستے بند ہو جائیں اور غلبۂ بیخودی (غیبت) کے آثار طاری ہونے لگیں اور طالب ہر چیز سے بے خبر ہو جائے حتیٰ کہ اس کو اپنی بے خبری کی بھی خبر نہ رہے۔

[1] جو کیف و کم سے پاک ہے۔

یہ طریقہ سیدنا حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی قدس سرہٗ العزیز کی طرف منسوب ہے ۔

لقمہ اتم التوجہات [1]

حضرتِ حق میں "توجہِ تام" اور مراتبِ حضور میں سے کامل ترین مرتبہ کو بعض مشایخ کرام نے یوں بیان فرمایا ہے :

(اے طالب!) جب تیرے سارے قوائے ظاہری و باطنی، جزوی و کلی اپنے اپنے تصرفات سے معطل ہو جائیں اور تیرا دل ہر علم اور ہر اعتقاد سے ——— بلکہ جملہ ماسوی سے ——— خالی اور فارغ ہو جائے، تب تو حق تعالے شانہٗ کی طرف متوجہ ہو جا (اور اُسے اسی طرح جان) جیسا کہ وہ فی الواقع ہے لیعنی اسے تنزیہہ یا تشبیہ میں مقید نہ کیجیو۔ بلکہ تیری یہ توجہ اجمالی اور ہیولانی ہونی چاہیئے جو نیک و بد، محسوس و غیر محسوس سبھی صورتوں کو تمام تر توحید، عزیمت و جمعیت اور پورے اخلاص کے ساتھ قبول کرے۔ تجھے اِس حالت کو ہمیشہ قایم رکھنا چاہیئے۔ اس ضمن میں کبھی پراگندہ خیالی یا ارادے کی کمزوری کا شکار نہ ہونا۔ اس بات کا پختہ یقین رکھنا کہ حق تعالے کا کمال جملہ صفات کو محیط ہے، خواہ کسی صفت کی خوبیاں ہمارے ادراک میں آئیں یا نہ آئیں۔ یہ بھی یقین کے ساتھ جان لو کہ عقل، فکر اور وہم میں سے کسی کو یہ طاقت نہیں کہ اس کے سرا پردۂ اسرار کے پاس بھی پھٹک سکے۔ پس او تعالے ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ ہے۔ وہ اگر چاہے تو صُورِ عالم میں سے ہر صورت میں یا جملہ عوالم کی تمام صورتوں میں ظاہر اور جلوہ گر ہو جائے اور اگر چاہے تو ان سب سے منزہ اور پاک رہے۔

لقمہ

[1] یعنی "توجہ کی جتنی بھی صورتیں ہیں ان میں سے کامل ترین صورت۔ پوری توجہ۔

سالک کو مناسب ہے کہ وہ مراتب تجلیات کے مبدأ سے لے کر منتہی تک (صرف) اپنے آپ کو ملاحظہ کرے بلکہ اس ملاحظہ کو ہمیشہ اپنا نصب العین بنائے۔ اسے فی الواقع ایک "وجودِ مطلق" کے سوا اور کچھ نظر نہ آنا چاہیئے۔ وجودِ مقید اور وجودِ حقیقی (اگرچہ بظاہر دو قسمیں ہیں لیکن) بحیثیت "وجود" وہ دونوں اقسام میں ایک ہی ہے۔ اطلاق اور تقید تو محض نسبتیں یا اعتبارات ہیں۔ اس ملاحظہ کی مداومت سے بے حد ذوق پیدا ہوتا ہے۔

لقمہ

دونوں آنکھیں بند کرے اور اپنے دل پر نظر جمائے اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر اور اپنے ساتھ جانے۔

لقمہ

دونوں آنکھیں کھلی رکھے اور نگاہ کو اوپر یا سامنے جمائے۔ کوشش کرے کہ پلک جھپکنے نہ پائے۔ اس شغل سے کچھ انوار ظاہر ہوتے ہیں۔ پلک سے ایک آگ بھڑکتی ہے جو سارے بدن میں پھیل جاتی ہے اور اس سے عشق پیدا ہوتا ہے۔

لقمہ سلطان الاذکار

دونوں آنکھیں کھولے رہے اور نگاہ کو اپنی ناک پر اس طرح جمائے کہ دونوں آنکھوں کی سیاہی غائب اور سفیدی ظاہر ہو جائے اور جمعیت خاطر حاصل ہو کر خطرات کی آمد یکسر بند ہو جائے۔

اس شغل کو "مقام نصیرا" کہتے ہیں۔ سالک کو اجازت ہے کہ وہ چاہے جلسۂ نماز کی طرح بیٹھے، چاہے کتے کے بیٹھنے والی نشست اختیار کرے۔

اور اگر نگاہ کو اپنی بھوؤں پر جمائے اور بدستور سابق اسی شغل کو پورا کرے تو اس سے بہت سے فوائد ظاہر ہوں گے۔ اس شغل کا نام "مقام محموداء" ہے۔

لقمہ

جوگ میں چوراسی بیٹھکیں (یا آسن) ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک خاص فائدہ ہے۔ لیکن شیخ بہاؤالدین قادری قدس سرہٗ نے ان میں سے ایک بیٹھک جو سب کی جامع ہے اسے اختیار فرمایا ہے اور وہ یہ ہے:

مربع بیٹھے اور دونوں پاؤں اکٹھے کرے۔ بائیں پاؤں کی ایڑی خصیتین کے نیچے اور داہنا پاؤں اس کے پاس رکھے۔ پھر مقعد رکھے۔ سانس اوپر کھینچ کر ناف کو پشت کی طرف سمیٹے اور منہ کو بند کرکے زبان تالو کے ساتھ چپکالے۔ اس کے بعد وہم میں مشغول ہو یعنی اپنے باطن میں تفکر کرے کہ "اُوْ ہی ہے" (دوران شغل) بھوکا رہے اور نیند کو ترک کر دے۔ اگر مسلسل تین دن تک بغیر کھائے اور بغیر سوئے اس شغل کو کرتا رہے تو ایسی بے ہوشی و بیخودی اس پر طاری ہوگی جس میں غیب کے پردے اس پر کھلنے لگیں گے اور اسے مکاشفہ حاصل ہونے لگے گا۔ پھر یا تو وہ ہوش میں آجائے گا یا مجذوب و مدہوش رہ جائے گا۔ اگر پہلے تین دن میں یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو اس کے متصل تین دن یہی شغل کرے۔ لیکن ہر تین دن کے بعد (یعنی درمیانی وقفے میں) کچھ کھا پی لیا کرے اور تھوڑی سی نیند بھی لے لیا کرے ورنہ سودائی ہونے کا اندیشہ ہے۔ بس اسی طرح کرتا چلا جائے۔

لقمہ

جلسۂ نماز میں بیٹھے اور علیم، سمیع، بصیر کو اپنے شیخ کی صورت کے ساتھ ملاحظہ کرے۔ ہر حال میں اس کا التزام رکھے۔ جب اس میں استقامت حاصل ہو جائے تو اسی طرح بیٹھے ہوتے اپنے چہرے کو دل کی جانب مائل کرے، آنکھوں کو بند کر کے چشم باطن سے دل پہ نگاہ کرے اور تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، جب اس میں بھی استقامت حاصل ہو جائے تو اسی ہیئت میں بیٹھے لیکن اب اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائے اور آنکھوں کو نیم باز کر کے یہ تصور کرے کہ میری روح بدن سے باہر نکل گئی ہے اور آسمانوں سے گذر کر حق تعالیٰ شانہٗ کے معائنہ (یعنی دیدار) میں مشغول ہے۔ اگر کوئی شخص اس پر استقامت پا جائے تو اس پر ایک سبز دھاگا ظاہر ہوگا جس کا ایک سرا ساتویں آسمان کے اوپر اور دوسرا سرا اس کے دل میں ہوگا۔ یہ فکر کا اعلیٰ درجہ ہے اور یہی وہ شغل ہے جسے مشائخ چھپاتے ہیں۔ اس مشغولیت میں ،، واسطہ ،، (یعنی صورتِ شیخ کا ملاحظہ) درست نہیں ہے۔

حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی قدس سرہٗ العزیز نے ان اشغال کو حضرت سلطان جی نظام الدین (محبوب الٰہی) قدس سرہٗ سے نقل کیا ہے۔

تتمہ

مراقبہ - تجویز کردہ حضرت گیسو درازؒ

سالک کو چاہئے کہ ساکت رہے اور سوچے کہ میں نہیں ہوں، وہی ہے ؎

من نیم، واللہ یاراں، من نیم
جان جانم، سرّ سرّم، تن نیم

جب انہی معنیٰ میں فکر کرے گا تو بحکم:

جاء الحق وزھق الباطل

"انا انت" (میں تُو ہوں) کی آواز اسے سنائی دے گی۔ یہ راستہ سب راستوں سے اقرب ہے۔

لقمہ ذکر "اللہ"

جو شخص مراقبہ اور اللہ کے ذکر میں مشغول رہے گا اس پر سارے عالم کی تجلی ہوگی۔ حضرت سلطان العارفین لڑکپن سے لے کر وفات تک اس شغل کو فرماتے رہے۔

لقمہ مراقبہ معراج العارفین

تمام موجودات کو متعدد آئینے فرض کرو۔ ان میں جو جو کمالات تمہیں دکھائی دیتے ہیں، یعنی تمہاری عقل یا تمہارے حواس خمسہ جن کو دریافت کرتے ہیں، ان سب کو حق تعالیٰ کے اسمأ و صفات کی صورتیں سمجھو۔ بلکہ سارے عالم کو ایک آئینہ فرض کر کے اگر تم اس آئینے میں حق تعالیٰ کو اس کے تمام اسمار و صفات کے ساتھ دیکھو تو تم اہلِ مشاہدہ میں سے ہو جاؤ گے جیسے اول اول تم اہلِ مکاشفہ میں سے تھے (اور وہاں سے ترقی کر کے اہلِ مشاہدہ میں سے ہوئے) تو اب یہاں سے آگے بڑھو۔ یوں ملاحظہ کرو کہ عالم کو دیکھو تو یہ جانو کہ تمہاری ذات جملہ کائنات کو محیط ہے۔ اور یہ سب کچھ خود تمہارے اندر مرتسم ہے۔ لہٰذا تمہاری ذات ان سب کا آئینہ ہے۔ پہلے پہل تم دوسروں کے اندر حق تعالیٰ کا مشاہدہ کیا کرتے تھے، اب خود اپنے اندر اس کا مشاہدہ کرو۔

پھر اس سے بھی آگے بڑھو اور ملاحظہ کرو کہ ممکنات، جیسا کہ وہ ہیں، معدوم و غیر موجود ہیں۔ ان کو درمیان میں نہ لاؤ اور سب کو حق تعالیٰ کی تجلیات کی صورتیں سمجھو جو اسی سے قائم ہیں لہٰذا یہ سب کمال اور جمال حق تعالیٰ کا ہے اور اس کا مشاہدہ بھی حق تعالیٰ ہی میں کر رہے ہو۔

پھر اس سے بھی برتر قدم رکھو اور اپنے وجود کو درمیان سے ہٹاؤ۔ مشاہدہ اور ادراک کرنیوالا

صرف حق تعالیٰ کو جانو۔ پس وہی شاہد، اور وہی مشہود ہے۔

لقمہ سلوک سلسلہ نقشبندیہ میں

سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں سلوک کی بنیاد تین طریقوں پر قائم ہے۔ پہلا طریقہ توجہ اور مراقبہ کا ہے۔ اس سے مُراد اُس معنیٰ بے چون و بے چگون اور بے شبہ و بے نمون کی طرف متوجہ ہونا ہے جو اسم مبارک "اللہ" سے مفہوم ہے لے

دوسرا طریقہ "رابطہ" ہے۔ یعنی شیخ، جو فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہے، کی صورت کی طرف اس طرح متوجہ ہونا کہ غیبت اور بے خودی پیدا ہو اور یہ صورت جو (مرید کی) جہت اسفل ہے نظروں سے اوجھل ہو جاتے اور اس کی نگاہ شہودِ ذات کے بحر اور حضور حق تعالےٰ (کہ جہت اعلیٰ ہے) پر پڑے۔

تیسرا طریقہ لاالٰہ الا اللہ کا ذکر خفی ہے۔ یہ ذکر نفی و اثبات کا جامع ہے۔

ان میں سے پہلا طریقہ سب سے بہتر اور اعلیٰ ہے لیکن قبل اس سے کہ یہ سالک میں اپنا تصرف کرے، اس کا حصول دشوار ہے۔ دوسرا طریقہ یعنی رابطہ سب طریقوں سے اقرب ہے اور اس سے عجائب و غرائب ظہور میں آتے ہیں۔ تیسرا طریقہ سب سے محکم ہے اور اس کی بنیاد بڑی استوار ہے۔

لقمہ آئینہ بینی

اکثر آئینہ دیکھا کرو اور اپنے خیال میں شیخ کی صورت کو قائم کرو۔ ہمیشہ اسی پر نگاہ رکھو

لے : یعنی لفظ "اللہ" سے جو ذات مفہوم ہوتی ہے اور جس کا کوئی مانند اور مثل اور مشابہ اور نظیر نہیں ہے۔

یہاں تک کہ (تمھاری اپنی شکل) حواس سے غائب ہو جائے۔

تتمہ

کلمۂ "اللہ" کا تصور

کلمہ "اللہ" کو سونے یا چاندی کے پانی سے لکھ کر ہمیشہ اسے دیکھا کرو۔ اور یہ بھی کرو کہ لفظ "اللہ" کی صورتِ وہمی کا اپنے صفحۂ دل پر نقش بنا کر ہمیشہ اس کی طرف متوجہ رہو یہاں تک کہ حواس سے غیبت حاصل ہو جائے۔

اے طالب حق! اللہ تعالیٰ تیرے اعمال کا خاتمہ بالخیر کرے، جان لے کہ پچھلے ہر دو وصل میں ذکر اور فکر کے جو اقسام بیان کئے گئے ہیں ان میں سے کسی ایک کی مداومت تجھے مطلوب تک پہنچا دے گی۔ بغیر مداومت اور استغراق و انہماک کے اگر کوئی شخص وصل کے خواب دیکھنے لگے تو یہ اس کی حماقت کی دلیل ہے۔ کیونکہ تصوف عمل کرنے کی چیز ہے نہ کہنے کی۔ لہٰذا جتنی زیادہ مشق کروگے اتنی ہی کامیابی ہوگی۔ حضرت ابوحفص حدّاد قدس سرہٗ فرماتے ہیں "تصوف پختہ ساختن وہمے بیش نیست،، یعنی تصوف وہم پکانے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ فی الواقع بات یہی ہے کہ جب یہ اوہام پک کر مغزِ جان تک پہنچ جائیں تو اس وقت خواص و عوام کو عجیب و غریب مشاہدات ہوتے ہیں جن سے صاحبِ مقام کو لذت ملتی ہے اور دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔ لیکن بعض نادان جنھیں چند اذکار و مراقبات کا علم ہوجاتا ہے محض اسی بنا پر اپنے آپ کو صوفی کہنے لگتے ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بے پایاں حلم ہے جو اُن کے گناہوں کو برداشت کئے جاتا ہے ورنہ یہ لوگ ہلاک ہونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ بعض لوگ اس سے بھی کم تر ثابت ہوتے ہیں یعنی کچھ دیر برائے نام ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور جب انھیں اس میں کوئی لذت یا اثر محسوس نہیں ہوتا تو ان میں سے کچھ لوگ تو اس کام سے دستبردار ہو کر پھر سے دنیاوی دہندوں میں پھنس جاتے ہیں، اور جو کچھ کرچکے ہیں اسے بھی چھوڑ دیتے ہیں یا کچھ لوگ اتنے پر ہی اکتفا کرکے مکر و فریب کا جال پھیلاتے ہیں اور اپنے آپ کو

عارف سمجھ کر ایک عالم کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب بے سود ہے۔ فاسد جگہ پر فاسد عمارت اٹھائی جائے تو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے مراتب سے بچائے۔ مرد وہ ہے جو اس راہ میں مردانہ وار قدم رکھے اور طریقت کا حق ادا کرے۔ اور جب تک صاحب تاثیر نہ ہو جائے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دے۔ بس غافل کی تنبیہہ کے لئے اتنا ہی بہت ہے، آگے سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

یہ خاتمہ ایک مخصوص طریقۂ ذکر پر مشتمل ہے۔ یہ ایسے صاحب اجتہاد مرید و طالب کے لئے ہے جس کا ظاہر انواع واقسام کی صلاحیتوں سے آراستہ ہو چکا ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ اگر وہ اس ترتیب کے مطابق چلتا رہا تو "فرق" یا پراگندگی کی پستی سے نکل کر "جمع" کی بلندی تک پہنچ جائے گا تشغل کے ضمن میں ہم نے اس کے بعض فائدوں کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور مطلوب تک پہنچانا اسی کا کام ہے۔ ہر گھڑی، ہر آن اسی پر ہمارا تکیہ ہے۔

تتمہ
علم بسیط اور علم مرکب

علم دو طرح کا ہے: بسیط اور مرکب۔ اگر "معلوم" ہر جہت اور ہر حیثیت سے واحد ہے تو لامحالہ اس کا علم بسیط (غیر مرکب) ہوگا اور اگر "معلوم" متعدد ہے لیکن اس کا ادراک اجمالی حیثیت میں ہو رہا ہے تو بھی یہ علم بسیط ہے۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ پہلا "بسیط حقیقی" ہے اور دوسرا "بسیط حکمی"۔

اگر "معلوم" واحد ہے لیکن کئی جہتوں اور حیثیتوں سے ادراک میں آ رہا ہے یا "متعدد"

ہے اور اس کا ادراک تفصیلی حیثیت میں ہو رہا ہے، تو بلاشبہ یہ "علم مرکب" ہے۔

صوفیائے کرام کی ہمت عالی ہمیشہ اس بات پر کمربستہ رہتی ہے کہ علوم مرکبہ کو درہم برہم کر کے ذاتِ واجب الوجود کے علم بسیط تک پہنچیں، اس طرح کہ ہمہ وقت ——— یا اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر اکثر اوقات ——— یہ جمعیت ان کو حاصل رہے اور جو تفرقہ ماسوی اللہ کے خیال سے دل میں پیدا ہوتا ہے اس سے گریز کر کے اسی جمعیت میں پناہ لیں۔ چنانچہ ماسویٰ کے فنا ہو جانے کو "فنا فی اللہ" کہتے ہیں اور اس حضور سے بھی فنا ہو جانے کا نام "فنائے فنا" ہے۔

تقمہ

طالب کسی گوشہ تنہائی میں، پوری طہارت کے ساتھ، قبلہ رُو ہو کر بیٹھ جائے اور اپنی آنکھوں کو بند کر کے زبان کو اچھی طرح تالو کے ساتھ چپکا لے۔ اب اپنے دل کی طرف متوجہ ہو کر سوچے کہ میرے سینے میں جو پارۂ گوشت ہے (جسے دل کہتے ہیں) لفظِ "اللہ" کہہ رہا ہے۔ لیکن مجھے سنائی نہیں دیتا۔ اب اسے سننے کی کوشش کرے اور اپنی تمام تر ہمت اس پر مبذول کرے۔ اللہ کی مدد شامل حال رہی تو تھوڑے ہی عرصے میں اسے ایک حرکت محسوس ہونے لگے گی اور اسے گمان ہو گا کہ یہ حرکت یا قلب کی ہے یا نفس کی یا پھر محض وسوسہ ہے۔ جب یہاں تک پہنچ جائے تو پہلے سے بھی زیادہ ہمت کے ساتھ کوشش کرے کہ یہ حرکت اور بھی واضح ہو تاکہ حرکتِ نفس یا وسواس کا اشتباہ باقی نہ رہے اور طالب بالتحقیق جان لے کہ یہ حرکت مضغہ دل ہی کی ہے اور وہ "اللہ، اللہ" کہہ رہا ہے۔

جب یہ سعادت حاصل ہو جائے تو اب طالب اپنی ہمت، اس بات پر مرکوز رکھے کہ اگرچہ اس کی زبان خاموش رہے لیکن وہ خلوت و جلوت میں اپنے دل کی آواز کو سنے۔

لقمہ ایضاً

یہ ایسی حالت ہے جس میں دل ذاکر ہو جاتا ہے۔ یہ دولت ہر شاغل کو اس کے مرتبہ کے مطابق نصیب ہوتی ہے۔ بعض اسے بہت جلد پا لیتے ہیں اور بعض کو بہت دیر سے ملتی ہے۔ یا بعض کو ذرا سی توجہ سے حاصل ہو جاتی ہے جب کہ بعض کو اس کے حصول کی خاطر بہت زیادہ توجہ اور کوشش صرف کرنی پڑتی ہے۔ لیکن بہر حال طالب کو چاہیئے کہ دل برداشتہ اور مایوس نہ ہو، کیونکہ ارشاد ہے:

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

یعنی خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو کیونکہ اس کی رحمت سے ناامیدی کافروں کا کام ہے

لقمہ حبسِ دم

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سانس کی آمد و رفت کے باعث یہ حرکت قلبی ظاہر نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں سانس کو زیر ناف روکنا چاہیئے۔ اس سے دل کی کیفیت اس لگن کی سی ہو جاتی ہے جو ہوا کے تموج سے محفوظ ہو اور جس میں بھرا ہوا پانی بالکل ساکن رہے۔ جب تک حرکت قلب محسوس نہ ہونے لگے، سانس کو روکنے کا عمل جاری رکھنا چاہیئے۔ تاہم حبس دم اتنا طویل نہ ہو کہ جس سے کسی مہلک مرض کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ کیونکہ اس کا نقصان حبس دم نہ کرنے سے زیادہ ہے۔ بس اتنا کرنا چاہیئے جتنا مقدور ہو۔ سانس کو آہستہ آہستہ چھوڑنا مناسب ہے اور اس موقع پر بھی حرکت قلب کا خیال رکھنا چاہیئے۔

لقمہ حرکتِ قلبی کی نگہداشت

جب حرکتِ قلب معلوم ہونے لگے اور ذکرِ قلب جاری ہو جائے تو اس کی اچھی طرح نگہداشت کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ حرکت اتنی ضعیف ہوتی ہے کہ ذراسی مزاحمت سے جاتی رہے گی اور پھر جتنی بھی کوشش کی جائے ہاتھ نہ آئے گی۔ بلکہ ایسی کوشش الٹا جمعیت اور حرکت کو کم کرنے کا باعث ہوگی۔ لیکن سالک کو مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ اسے چاہیئے کہ عجز و انکسار اور خشوع وخضوع کے ساتھ اپنی کھوئی ہوئی دولت کو طلب کرے۔ اکثر حالات میں حدیث نفس یا خطرہ یا اشیاء منکثرہ کا علم اس سررشتہ کے ہاتھ سے نکل جانے کا باعث ہوتا ہے۔ ہم دوسرے وصل کی ابتداء میں اس کو بیان کر چکے ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ آنِ واحد میں دل کا اصالۃً دو جانب متوجہ ہونا محال ہے۔

لقمہ ایضاً

جب یہ جلیل القدر نعمت حاصل ہو جائے تو اسے حقیر اور معمولی شے نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ شب و روز اس نسبت کی پرداخت میں لگے رہنا چاہیئے۔ طالب انتہائی ضرورت کے وقت کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہو۔ بلکہ اگر نوافل، وظائف یا تلاوتِ قرآن وغیرہ اس میں مخل ہوں تو ان کو بھی ترک کر دے۔ ہاں، اگر یہ امور حفظِ نسبت میں خلل انداز نہ ہوں تو پھر ان کے کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بلکہ یہ بھی اس کام کے موئید بن جائیں گے۔ بس طالب کو چاہیئے کہ ہمہ تن اس نسبت میں لگا رہے۔ آنکھ کو تھوڑا سا کھول کر اس (نسبت) کا استحضار کیا کرے حتیٰ کہ اسے یہ ملکہ حاصل ہو جائے کہ وہ آنکھیں کھول کر بھی قلب کی طرف متوجہ رہ سکے۔ اسی کا نام "خلوت در انجمن" ہے تائیدِ الٰہی سے جب یہ نسبت قوی ہو جائے گی تو پھر سالک اگر کبھی بھول بھی جائے تو ذراسی

توجہ سے اسے دوبارہ پالے گا بلکہ بازیافت پر یہ اور بھی زیادہ ہوگی اور بڑھتی ہی جائے گی ، کسی مانع یا رکاوٹ سے ہرگز زائل نہ ہوگی۔ اس مرتبہ میں طالب کو ذکر سے بڑی لذت اور جمعیت حاصل ہوگی ۔

لقمہ ذکر کا جملہ اعضائے بدن میں پھیل جانا

جب حرکت قلب اس حال کو پہنچ جائے کہ زبانِ دل سے لفظ "اللہ" کا ذکر سن کر ذرا سی تکلیف نہ ہو تو وہ حرکت جو قلب صنوبری سے ظاہر ہوئی تھی، پورے بدن میں پھیل جائے گی۔ اس کے پھیلنے کی صورت یہ ہے کہ پہلے طالب کے کسی ایک عضو بدن میں اس کا ظہور ہوگا، یعنی جس طرح مضغۂ دل میں وہ حرکت محسوس ہوتی تھی بعینہٖ وہ حرکت اس عضو میں محسوس ہوگی، کبھی ہاتھ متحرک ہوگا اور کبھی پاؤں اور کبھی سر، حالانکہ طالب ان میں سے کسی عضو کو حرکت دینے کا قصد بھی نہ کرے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ حرکتِ عضو کی طرف ہرگز متوجہ نہ ہو کیونکہ ایسا کرنے سے دل غافل ہو جائے گا ۔ اس کی تمام تر توجہ بس دل پر مرکوز رہنی چاہیئے۔ اس کام میں دل ہی راس اور رئیس ہے اور جملہ اعضا اس کے تابع ہیں ۔

لقمہ ایضاً

جب ذکر کا نور پھیلنے لگے گا تو تھوڑے ہی عرصہ میں پورے بدن کا احاطہ کرلے گا ۔ سر سے لے کر پاؤں کے ناخن تک ہر عضو ذکر سے معمور ہو جائے گا۔ تب سالک پر مختلف حالتیں طاری ہوں گی۔ کبھی ہنس رہا ہے تو کبھی رو رہا ہے۔ کبھی خوش ہے تو کبھی اداس ہے۔ کبھی حیران ہے تو کبھی بریان ہے۔ لیکن کوئی بھی حالت ہو اس پر التفات نہ کرنا چاہیئے۔ بس ذکر سے کام رکھے کہ

اہم ترین بات یہی ہے۔ تائید الٰہی شامل حال رہی تو پورے بدن سے بیک وقت لفظ "اللہ" کا ذکر سنائی دے گا اور جملہ اعضاء دل کے ہمنوا ہوں گے۔ اس حالت میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض اعضاء میں غلبۂ ذکر بڑھ جاتا ہے اور بعض میں کم رہتا ہے۔ اور کبھی تمام اعضاء میں مساوی ہوتا ہے۔ زیادہ لذت اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے کہ تمام اعضاء میں غلبۂ ذکر مساوی ہو۔ اس کیفیت کو اصطلاح صوفیہ میں "سلطان الذکر" کہا جاتا ہے۔

لقمہ ذکر قلب کا سنائی دینا

ذکرِ قلب کا علم پہلے پہل قوت سامعہ کی مدد کے بغیر ہوتا ہے لیکن جب یہ ذکر قلب میں قرار پکڑ لیتا ہے تو اکثر لوگوں کو یہ کانوں سے بھی سنائی دینے لگتا ہے۔ اس مقام میں صاحبِ فطرت طالب پر "واسطۂ استماع" خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

لیکن عام طور پر جو یہ بات مشہور ہے کہ سالک کے دل کا ذکر دوسرا شخص بھی سن سکتا ہے غلط عوام ہے۔ لہٰذا جو لوگ اس بات کے قایل ہیں کہ سالک کے ذکر کی آواز کوئی دوسرا شخص، سامعین اور ذاکرین کے تفاوتِ درجات کے مطابق، دور سے یا قریب سے سن سکتا ہے، غلطی پر ہیں۔ شیخ شرف الدین یحیٰی علیہ الرحمہ معدن المعانی میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک جماعت نے جو بعض اہل اکتساب سے اس قسم کی آواز کا سنائی دینا نقل کیا ہے تو ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ جب ذکر کو سینے سے کھینچتے ہیں تو ایک خفیف سی آواز حلق سے پیدا ہوتی ہے جس سے سننے والے کو گمان ہوتا ہے کہ یہ آواز دل کی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہم نے اس قسم کی آواز نکلتے ہوئے دیکھی اور سنی ہے۔ باقی اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے۔

لقمہ غلبۂ ذوق

بعض اوقات کسی سِرّ کے ظاہر ہونے سے سالک کو جو ایک خاص ذوق حاصل ہوتا ہے وہ سالک پر غالب آجاتا ہے۔ یہ بات اس کی ترقی کے لئے مانع ہے۔ اگر اس کی باطنی حالت کو اس بات سے تشویش لاحق ہو تو سالک کو چاہیئے کہ ظاہری و باطنی آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے شیخ کی طرف رجوع ہو۔ اگر شیخ اپنے مرید کے حال کو سمجھتا ہو اور اس کی مشکل کا حل جانتا ہو تو صراحتہً یا کنایۃً بتادے اور نہیں تو اس بات کو موقوف رکھے کہ ابھی اس کے کشف کا وقت نہیں آیا۔

لقمہ — ذکر کا مقصود

ذکر کا مقصد مذکور میں فنا ہوجانا ہے۔ لہٰذا محض زبان اور دل سے کلمہ جلالہٗ کے تلفظ پر اکتفا نہ کرلینا چاہیئے۔ اگرچہ اس سے بھی کچھ نہ کچھ فائدہ تو ضرور حاصل ہوگا لیکن بے حضورِ مذکور گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ کیونکہ ذکر سے مقصود مذکور میں فنا ہونا ہے نہ کہ اسم مذکور میں۔

لقمہ — غلبہ ذکر

اس مرتبہ کے سالکین جن جن عجیب و غریب حالات و واردات سے دو چار ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مخلوقات جو ذکر کرتے ہیں سالکین کو اس کا علم ہوتا ہے۔ اگرچہ بتدریجاً ایسا ہوتا ہے۔ لیکن سالک کو اس پر رکنا نہ چاہیئے کیونکہ مقصود اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس جگہ ایک بہت باریک بات ہے جس کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اس مرتبہ میں لوگ جب ذکر "اللہ" میں مشغول ہوتے ہیں تو ان کو جنگل، صحرا، در و دیوار، پتھر، کنکر یہاں تک کہ اپنے ہاتھ پاؤں "اللہ، اللہ" کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ دراصل اس کا سبب خود ذاکر پر اس کے ذکر کا غلبہ ہے۔ یہ کیفیت ذکرِ کائنات کے سماع سے قطعاً الگ شے ہے۔ کیونکہ ہر مخلوق کا ایک مخصوص "ذکر حالی" ہے، جیسا کہ اکثر علماء کی یہی رائے ہے، اگرچہ بعض "ذکر مقالی"

کے بھی قائل ہیں۔ لہٰذا ہر مخلوق کی تسبیح سے واقفیت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ان کے متغائر و متفاوت معانی کا پورا ادراک حاصل ہو۔ کائنات کا ہر فرد ایک مختلف ذکر کے ساتھ ممتاز ہے اور ہر نوع، ہر جنس کے لئے ایک معین ذکر ہے جس میں وہ مشغول ہے اور کیونکہ جملہ شیئون کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں جو مخصوص اذکار کی متقاضی ہیں۔ تاہم اگر سالک کو ذکر "اللہ" کی حالت میں دیوار کا ایک خاص ذکر، دروازے کا ایک خاص ذکر، مصلے کا ایک خاص ذکر ——— وعلیٰ ہذالقیاس ——— سنائی دے تو ہو سکتا ہے کہ یہ مخلوقات کا ذکر ہو جس پہ وہ مطلع ہو رہا ہے۔ پھر بھی اس مرتبہ میں احتمال کی گنجائش نہیں ہے۔

لقمہ حرکت متصل

اس مرتبہ عالی اور رتبہ علیا کو پا لینے کے بعد کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قلب صنوبری کی طرف توجہ تام کی حالت میں دل اور شریانوں کے اندر ایک حرکت محسوس ہوتی ہے جو اپنی کیفیت میں سابقہ حرکت کی مانند نہیں ہوتی۔ کیونکہ پہلی حرکت منفصل ہوتی ہے جب کہ یہ حرکت متصل ہوتی ہے۔ مثلاً پہلی حرکت کلمۂ ہُو، ہُو کی پیہم تکرار سے مشابہت رکھتی ہے اور دوسری حرکت کلمۂ ہُو کو ایک ہی بار طویل مد کے ساتھ ادا کرنے کی مانند ہے۔ یا پہلی حرکت کی مثال یوں سمجھو جیسے جھرنے سے پانی گرنے کی آواز کہ تھوڑا سا ایک جگہ سے دوسری جگہ پر گرے اور دونوں جگہ کی آواز ایک دوسرے سے جدا لیکن پیہم سنی جائے اور دوسری حرکت کی مثال آبشار کی آواز ہے جو پانی کے یکلخت گرنے سے بغیر انقطاع کے پیدا ہوتی ہے۔ ایک اور مثال سنو۔ پہلی حرکت ہتھوڑے سے نہائی پر متواتر اور پے در پے ضربیں لگانے سے پیدا ہونے والی آواز کی مانند ہے جب کہ دوسری حرکت اس آواز سے مشابہت رکھتی ہے جو کانسی کے برتن پر ایک بار ضرب لگانے سے پیدا ہوتی ہے اور تادیر رہتی ہے قطع نظر اس سے کہ یہ آواز شروع میں بلند اور قوی

ہوتی ہے پھر گھٹتے گھٹتے آخر میں بہت مدہم رہ جاتی ہے۔ اور حرکتِ ثانیہ، حرکتِ اولیٰ سے کہیں زیادہ لطیف ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بڑی مشق کے بعد کہیں جاکر یہ محسوس ہوتی ہے۔

جاننا چاہیئے کہ "حرکت اُولیٰ"، جو منفصل ہے، سالک اس کو کلمہ "اللہ"، یا کلمہ "حق"، یا کلمہ "ہو"، یا ایسے ہی کسی اور کلمے پر حمل کر سکتا ہے۔ چونکہ ان میں سے ہر کلمہ کی ایک صوتی شکل ہے جو ابتدا اور انتہا رکھتی ہے، لہٰذا ایسی "منقطع" آواز جس کے ہر جزو کا مبتدا اور منتہا متعین ہو، اسے ان کلماتِ منقطعہ پر حمل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن "حرکت ثانی"، جو ایسی متصل اور واحد (آواز) ہے جس کے نہ کسی مبتدا، کا پتہ ہے نہ منتہا کا، اسے کیونکر ان کلماتِ منفصلہ پر حمل کیا جا سکتا ہے جو مبادی و نہایات پر مشتمل ہیں؟ (اس کا حل یہ ہے کہ) اس کو ذکر کی بجائے مذکور پر حمل کریں یعنی اسم کی بجائے مسمیٰ پر۔ برخلاف "حرکت اولی"، کے جو ذکر اور اسم پر محمول ہے اور مذکور و مسمیٰ اس میں ضمناً حاصل ہوتا ہے جب کہ حرکت ثانی میں مذکور و مسمیٰ اصالتاً معتبر ہے۔ بعض مشایخ کرام سے یہی سنا ہے۔ اس مقام کو ذرا تفصیلاً بیان کر دیا جائے تو مناسب ہوگا:

اگر کوئی یہ کہے کہ مطلوب یا "مذکور" ایسا "مطلق" ہے کہ اس کے وصفِ اطلاق کو ہم "قید" کے طور پر بھی یہاں نہیں بول سکتے (یعنی لابشرط شئے نہ بشرط لا شئے) اور سالک جو اس مقام میں "حرکت ثانی"، کو جو عالم محسوسات میں سے ہے، محسوس کرتا ہے، اس کو مقصود پر کس طرح حمل کر سکتا ہے؟ ہم جواب دیں گے کہ درست ہے، مگر یہ بھی جان لو کہ جس میں کچھ بھی اطلاق ہے وہ مقصود سے قریب تر ہے بہ نسبت اس کے جس میں کچھ تقید ہے۔ اور چونکہ "حرکت ثانیہ"، میں بہ نسبت "حرکت اُولیٰ"، کے زیادہ اطلاق ہے، لہٰذا وہ مقصود کے ساتھ زیادہ مشابہ ہے۔ اور درحقیقت یہ دونوں حرکتیں عالم تنزلات سے ہیں اور اسماء و صفات کے مظاہر ہیں سلوک میں یہ راہِ مقصود اس وقت دکھائی دیتی ہے جب سالک فنائے فنا اور بقائے بقا کی منزل میں قدم رکھتا ہے اور یہ اکثر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اپنا ایک واقعہ بطور تتمہ یہاں بیان کرتا ہوں۔

یہ اِس فقیر کا ابتدائے حال کا زمانہ تھا، ایک دن صراطِ مستقیم کی طلب میں ایک بزرگ[1] کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فقیر اس سے پہلے بھی شغل سے خالی نہ تھا بلکہ اس شغل نے ایک صورت اختیار کر لی تھی پھر بھی مجھے ایک تشنگی سی تھی۔ یہ شغل جو میں کرتا تھا وہ "فکر" سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ بزرگ مجھے فرمانے لگے کہ تمھارے لیے مناسب شغل "صوتِ سرمدی" ہے جسے "صوتِ لایزالی" بھی کہتے ہیں۔ یوگ میں اس کا نام "انہد"[2] میں نے عرض کیا کہ وہ شغل مجھے بتلا دیجئے۔ فرمایا، اپنے دو ہاتھوں کی انگشت شہادت سے دونوں کان اچھی طرح بند کر لو اور متوجہ رہو تمہیں

ایک آواز سنائی دے گی جو پانی کے پیہم گرنے کی آواز سے ملتی ہوئی ہوگی۔ بس اس آواز پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھو اور ایک لحظہ کے لیے بھی غافل نہ ہو جب اس میں استحکام پیدا ہو جائے تو انگلیوں کے دباؤ کو ذرا ڈھیلا کر کے (آواز کی طرف) متوجہ ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ ماحول کے شور و غل کے باعث یہ آواز آنا بند نہ ہو۔ اسی طرح مشق کو بڑھاتے جاؤ یہاں تک کہ بغیر کان بند کئے آواز سنائی دینے لگے اور دنیا کا شور اس میں مزاحم نہ ہو بلکہ تمھارے لیے یہ آواز سب آوازوں پر غالب رہے، اس وقت تم اپنے اندر ایک ایسا ذوق و شوق پاؤ گے جو زبان و قلم کے بیان سے باہر ہے۔ بعض لوگ گول مرچ کو روئی میں لپیٹ کر کان کے سوراخ میں ٹھونس لیتے ہیں۔ مرچ کی حرارت سے یہ آواز اور بھی قوی ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگوں سے میں نے سنا ہے کہ وہ مرچ میں دھاگا

---

[1] : ان بزرگ کا نام محمد صادق ہے۔ آپ میاں پیر محمد ساون کے مرید اور خلیفہ تھے۔

[2] : یہ لفظ دراصل "انحد" ہے جو اَن (ہندی کلمۂ نفی) اور حد سے مل کر بنا ہے یعنی بے نہایت۔ چونکہ یہ آواز بے ابتدا و انتہا متحقق ہوتی ہے اس لیے یہ نام ہوا۔

حضرت شاہ نیاز بریلویؒ فرماتے ہیں :

بشنوی یک کلامِ نامقطوع ۔۔۔ اول و آخرش چو بے حد شد

از حدوث و فنا بود مرفوع ۔۔۔ زاں سبب نامِ اُو بہ "انحد" شد

باندھ لیتے ہیں۔ غالباً اس سے مقصود یہ ہے کہ مرچ کو باہر نکالنے میں سہولت رہے اور وہ کان کے اندر پھنس کر نہ رہ جائے۔ (اور بعض) مرچ کو سرخ حریر میں لپیٹ کر کان میں رکھتے ہیں تاکہ اس کی حرارت زیادہ سے زیادہ ہو اور آواز میں قوت آجائے۔ ایک سال کے بعد ان مرچوں میں یہ خاصیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ امراضِ چشم میں بہت مفید ہیں۔ میں نے ان کے ارشاد کے مطابق ان کے سامنے اپنے کانوں کو انگلیوں سے بند کیا۔ فی الواقع جیسا انھوں نے فرمایا تھا ویسی ہی آواز سنائی دی۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک میں اس میں مشغول رہا۔ جو لطف میں نے اس میں پایا وہ قبل ازاں مجھے حاصل نہ ہوا تھا۔ (بالآخر) میں نے ان سے عرض کیا کہ مولینا، جس مقصود کی مجھے طلب ہے اس تک رسائی کب ہوگی۔ یہ شوق (جو اس شغل سے حاصل ہوا ہے) بجا لیکن یہ اس مقصود کے برابر تو نہیں ہو سکتا۔ فرمایا کہ "میاں میر لاہوری علیہ الرحمہ اور ان کے مریدین یہی شغل کیا کرتے تھے اور اسی سرمدی آواز کو "حضرت حق" کہا کرتے تھے۔ چونکہ میں طالب علم تھا اور کتبِ متداولہ پر نگاہ تھی اور ابھی میرا ابتدائے حال تھا، اس لیے مجھے ان کی اس بات سے بہت کوفت ہوئی اور میں نے یہ شغل ہی ترک کر دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی برکت سے مجھے مدینہ منورہ جانا نصیب ہوا اور میں اپنے شیخ حضرت یحییٰ مدنی رضی اللہ عنہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو میں نے یہ قصہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ شغل بہت مفید ہے اور اصحابِ کرامت اور اہل استدراج کے درمیان مشترک ہے۔ اس میں یہ اثر ہے کہ پراگندہ خاطری کو دور کر کے جمعیت پیدا کرتا ہے اور ہر طرف سے یکسو کر دیتا ہے۔ یہی چیز طالب اور اس کے مقصود کے درمیان ایک ربط کی صورت بن جاتی ہے اور طالب میں بیخودی اور غیبت، جو فناء الفنا کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہے، پیدا کرتی ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ "حق" یہی ہے تو یہ قول اطلاق کے ساتھ جو مشابہت اس میں مضمر ہے اسی کے اعتبار سے ہے ورنہ (حق تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ)

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝

اطلاق وتقید میں اعتباری مشابہت کا ذکر ہم حرکت اولیٰ و حرکت ثانیہ کے ضمن میں اوپر بیان کر چکے ہیں۔

تقمہ فنا الفناء

جب یہ حرکت، جسے حرکت متصل سے تعبیر کیا جاتا ہے، سالک کو محسوس ہونے لگتی ہے تو بعض کے مزاج کی صفائی اور قوت حرکت کے باعث ان کے سارے بدن میں پھیل جاتی ہے اور بعض کے کسی ایک حصہ بدن تک محدود رہتی ہے۔ بہرصورت اس کا ظہور مقصود کی طرف متوجہ ہونے کا باعث ہے۔ اگر مقصود کی طرف توجہ پیدا نہ ہو تو (سالک کو چاہیئے کہ) بلا اعتبار اسم مضغۂ قلب کی طرف توجہ کرے۔ اگر یہ دشوار ہو تو اسم کے ضمن میں توجہ کرے لیکن اس درجہ میں بلا اعتبار مسمیٰ محض اسم کی طرف توجہ کرنے میں بڑا ضرر ہے بلکہ یہ مرتبہ اس کے مقابلے میں کفر ہے۔ حسنات الابرار سیئات المقربین (نیکوں کی نیکیاں مقربین کا گناہ ہیں) اسی کا بیان ہے۔

مذکورہ حرکت متصل کا علم سالک کو ایسا ہونا چاہیئے گویا یہ (علم) بھی ایک حرکت ہے جو اس حرکت متصل پر منطبق ہے، کیونکہ علم ہی ایسی چیز ہے جو "مقدار" رکھتی ہے اور ہم یہ سارے حیلے اسی علم کی افزائش و ترقی کے لیے کرتے ہیں، اس لیے کہ ثواب و عتاب، قرب و بعد، اور حضور و غیبت سب علم پر موقوف ہیں۔ چونکہ ہر دو حرکت کی اصل (یعنی جڑ بنیاد) دل ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو اس حرکت کے علم کا استفادہ، کسی دوسرے عضو کی بجائے صرف دل سے کرنا چاہیئے کیونکہ دل کے علاوہ کسی اور عضو کی طرف متوجہ ہونا دیگر اعضائے بدنی کی طرف توجہ کا موجب ہے۔ جب (سالک کا) پورا بدن اس حرکت سے مشرف ہو جائے (یعنی اس کا رواں رواں ذکر سے معمور ہو جائے) تو اسے چاہیئے کہ "مذکور" کو اس حرکت کل بدن

پر منطبق کرے اور "علم" کو اس مذکور پر منطبق کرے۔ یہ تین چیزوں کا انطباق ہوا یعنی :

(۱) حرکت کل بدن

(۲) مذکور (جو کلمہ "اللہ" کا معنیٰ اور دراصل اس اسم کا مسمیٰ ہے) اور

(۳) مذکور کا علم

ان تینوں کے انطباق کی مثال ایسی ہے جیسے : فاصلہ[۱]، رفتار[۲] اور وقت[۳] کا انطباق۔ (یہ علم ریاضی کا مسئلہ ہے) جو تم نے مسایل کمیّت کے ضمن میں اعراض کی بحث میں پڑھا ہوگا۔

اس مرتبہ میں غیبت و بیخودی کا ہجوم ہوتا ہے اور یہ فنار الفنار کی منزل ہے۔

تتمہ — علم "مذکور" بلاواسطۂ پارۂ دل

جب ریاضت سے (سالک) اس درجہ تک پہنچ جائے کہ اسے اکثر اوقات میں اس "حرکت" کا علم حاصل رہنے لگے تو اب اسے اپنی ہمت اس بات پر صرف کرنی چاہئے کہ اسے یہ علم مُضغہ (یعنی پارۂ دل) کے واسطہ کے بغیر حاصل ہو، اور اس کی توجہ پارۂ دل کی طرف مطلقاً نہ ہو۔ (اس کوشش کے نتیجہ میں سالک کو) ترقی ہوگی اور مُضغہ یا جملہ بدن کی حرکت سے اس کی توجہ منقطع ہوکر صرف "مذکور" کا علم باقی رہ جائے گا۔ دونوں طرف ———— یا ایک طرف ———— کے معدوم ہونے کی وجہ سے انطباق معدوم ہو جائے گا۔ عدم الطرفین اس صورت میں ہوتا ہے کہ ہم علمِ مذکور اور علمِ حرکت میں انطباق فرض کرلیں۔

(سالک کو یہ بھی چاہیئے کہ) اس نسبت کی پرورش پوری ہمت کے ساتھ کرے اور اسے قلت سے کثرت اور پھر کثرت سے دوام تک پہنچائے۔ بعض اوقات ضعفِ نسبت کے سبب بلا واسطۂ "حرکت" اس نسبت کی نگہداشت نہیں ہوسکتی۔ اگر صورت حال یہ ہو تو پھر اسی حرکت کو وسیلہ بناکر متوجہ ہو اور اس میں تعطیل نہ ہونے دے۔ اگر "حرکت منقصلہ کلیہ بدنیہ" سے غفلت ہو جائے تو اس کے بعد

"حرکت منفصلہ کلیہ قلبیہ" کی طرف متوجہ ہو۔ وہ بھی مفقود ہو جائے تو "حرکت منفصلہ جزئیہ قلبیہ" کی طرف متوجہ ہو۔ اور وہ بھی نہ رہے تو (اگر ہو سکے تو) سرد پانی سے غسل کرے یا دو تین مرتبہ پوری قوت کے ساتھ سانس کو خارج کرے (یعنی تخلیہ کرے) یا اسم فَعَّالٌ کو حضور قلب کے ساتھ اور معنی کو سمجھ کر چند بار دہرائے۔ انشاء اللہ ایسا کرنے سے اس کی کھوئی ہوئی شے اسے مل جائے گی۔

تتمہ
حضورِ مذکور

جب (سالک پر) عنایت الٰہی ہو اور ریاضت کے نتیجہ میں اکثر اوقات "مذکور" (یعنی حق تعالیٰ شانہٗ) کی حضوری اسے حرکتِ کلیۂ بدنیہ کے بغیر ہی حاصل رہنے لگے تو اسے چاہیئے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اس دولتِ عظیم سے غافل نہ ہو چاہے وہ افعالِ جوارح میں مشغول ہو اور چاہے افعالِ قلب میں[1] (بالفاظ دیگر سالک کی) حالت یہ ہو کہ: دست بہ کار و دل بہ یار

رُباعی

سر رشتۂ دولت اے برادر بکف آر   ویں عمر گراں مایہ بغفلت مگذار
دایم، ہمہ جا، باہمہ کس، در ہمہ کار   میدار نہفتہ چشم دل جانب یار

اے برادر! دولت کی ڈوری کا سرا تھام لے۔
اور یہ عمر عزیز غفلت میں بسر نہ کر۔
ہر وقت، ہر جگہ، ہر ایک کے ساتھ، ہر کام میں،
پوشیدہ طور پر اپنے دل کی آنکھ کو دوست کی طرف متوجہ رکھ۔

---

[1] یعنی چاہے اس کی مصروفیت جسمانی ہو چاہے قلبی۔

تتمہ — ذکرِ قلبی

"مذکور" کی طرف توجہ اگر بلا انطباق کے میسر آجائے تو اسے بہت بڑی دولت سمجھنا چاہئے کیونکہ اس مرتبے میں (سالک کو) ذکر قلبی حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب تک "حرکت" درمیان میں موجود ہے ذکر قلبی کا حصول ممکن نہیں ہے۔ دل ایک رحمانی لطیفہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ نہ جسم ہے نہ جسمانی، بعض نے اسے قوتِ درّاکہ[1] سے تعبیر کیا ہے۔ کچھ لوگ اسے "مجرد" قرار دیتے ہیں، ایک گروہ کے نزدیک وہ "بخار لطیف" ہے، کچھ اور لوگوں نے کہا کہ وہ "عالم امر" سے ہے، ایک گروہ اسے عرض سمجھتا ہے تو دوسرا جوہر قرار دیتا ہے۔ اور بعض اس باب میں سکوت اختیار کرتے ہیں۔ ہم نے اس کی تفصیل اپنی کتاب "عشرۂ کاملہ" میں بیان کر دی ہے اور بتایا ہے کہ قلب، نفس روح اور عقل کے اطلاقات کیا ہیں۔ نیز یہ کہ عالم عوارض میں جو حرکت اجرام و اجسام سے دیکھنے میں آتی ہے وہ دل سے منزلوں دور ہے۔

تتمہ — ظہورِ انوار

جب سالک کو ذکر قلبی حاصل ہو جاتا ہے تو اس پر انوار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ یہ انوار اسے کبھی تو اپنے اندر دکھائی دیتے اور کبھی اپنے سے خارج ہیں۔

سالک اپنے وجود میں جب ان انوار کو دیکھتا ہے تو یا اُسے یہ اپنے دل میں نظر آتے ہیں یا سر میں۔ یا پھر وہ انھیں اپنے داہنے یا بائیں ہاتھ میں دیکھتا ہے۔ بہر حال یہ ساری صورتیں اچھی ہیں۔ کبھی کبھی یہ انوار سالک کے پورے بدن میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔

---

[1] قوت درّاکہ: بہت زیادہ ادراک کرنے والی قوت۔

اور جب سالک کو یہ انوار اپنے وجود سے خارج میں نظر آتے ہیں تو کبھی یہ اس کی داہنی جانب سے ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی بائیں جانب سے۔ کبھی ان کا ظہور سر کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی بالکل سامنے سے۔ یہ تمام صورتیں اچھی ہیں۔ ان کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ سالک کے لئے اس مرتبہ میں رکنا اور انوار پر فریفتہ ہونا کوئی سود مند بات نہیں ہے۔ جس سالک کو اس راہ کے طے کرتے کوئی انوار دکھائی نہ دیں اس کا سلوک ہر خطرے سے محفوظ ہے اور اس کے مقصود تک جلد پہنچنے کی امید ہے۔ اگرچہ اس دولت (یعنی انوار) کا ظہور بھی ایک رحمت ہی ہے پھر بھی کوشش کرنا چاہئے کہ یہ علم بلاکیفیت اور بلا جہت پیدا ہو تاکہ علم اور معلوم (یعنی مطلوب) کے درمیان اطلاق اور عدم تقید کی نسبت جیسی ہونی چاہئے ویسی حاصل ہو۔ اس بات کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا مناسب ہوگا جو یوں ہے کہ سالک اپنے قلب میں ایک نسبت پاتا ہے جس کی مثال ایک ڈوری کی سی ہے جو اس کے قلب سے نکل کر ذات مطلوب تک چلی گئی ہو لیکن وہاں پہنچ کر ختم ہو جائے۔ چونکہ وہ ذات (حق سبحانہٗ و تعالیٰ) اپنے اطلاق کی وجہ سے اس تعین سے پاک ہے کہ یہ ڈوری اس سے جڑ سکے۔ ناچار (یہ ڈوری) امر مطلق سے مربوط ہو کر اپنی ذات کی حد تک اس طرح غیر متعین ہو جاتی ہے کہ کیف و کم کا شایبہ تک اس میں نہیں رہتا۔ جو سالک علوم عقلی سے بے بہرہ ہوتے ہیں وہ اس قسم کے تصور سے تذبذب میں پڑ جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ علوم کی باریکیوں سے آگاہ ہیں ان کو اس میں ذرا سی بھی پریشانی نہیں ہوتی۔ ہاں بے مزگی کی بات اور ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ کیونکہ ابتدائے حال میں سالک اس ڈوری کو امر مطلق کے ساتھ ہر جہت سے مربوط کرنے میں کوئی لذت محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ اس کام کو ایک طرح کی بیکاری اور تضیع اوقات خیال کرتا ہے۔ بہرحال اسے چاہئے کہ اپنے عشق کو اپنا مددگار بنائے، کمال شغف کی قوت کو بروئے کار لائے اور ان مراتب عالیہ کا خیال کرتے ہوئے جو اس بے مزگی کا ثمرہ یا انعام ہیں وہ اپنے آپ کو اس کام کے لئے مستعد بنائے۔ ایک بار وہ ادھر لگ گیا اور اس کے وہم میں پختگی آگئی تو پھر اسے معلوم ہوگا کہ اس میں کیا کیا کچھ ہے۔

مشایخ علیہم الرحمہ اس مقام میں سالکوں کو زیادہ اوراد و وظایف اور کثرت نوافل بلکہ ہر اس شے سے جو اس نسبت کے منقطع ہوجانے کا باعث بن سکتی ہو، منع فرماتے ہیں۔ بعض مشایخ جب یہ دیکھتے ہیں کہ مرید کے لئے ایسے امر مطلق کا حاصل کرنا دشوار ہے تو اسے، بلا اعتبار تعین و تشخص، سارے عالم کی طرف متوجہ ہوجانے کا حکم دیتے ہیں کیونکہ تعین و تشخص کے ہٹ جانے کے بعد صرف اطلاق ہیولانی باقی رہ جاتا ہے۔

بعض سالک اس ذات مطلق کو نور کا لامتناہی سمندر اور اپنے آپ کو نور کا ایک قطرہ تصور کرتے ہیں ——— قطرہ جو اس دریائے نور میں مل کر اپنی ہستی کھو چکا ہے۔

بعض اس ہست مطلق کو غیر متناہی ظلمت یعنی گھپ اندھیرا قرار دے کر خود کو اپنا سایہ سمجھتے ہیں جو اس اندھیری رات میں اس کے اندر گم ہو چکا ہے۔

اور بعض اس کو زمین اور آسمان اور جملہ اشیائ کے درمیان ایک خلا تصور کرتے ہیں۔ وغیر ذالک۔

یہ سب معقول کی محسوس کے ساتھ تمثیل ہے تاکہ کمزور عقل والے سمجھ لیں۔ ورنہ کہاں وہ ذاتِ ارفع و اعلیٰ اور کہاں یہ تمثیلات۔ دراصل یہ وہی بات ہے کہ جس کو جس سے عشق ہوتا ہے وہ اس کے ڈھنگ پر چلتا ہے مقصود ان سب کا یہ ہے کہ سالک کی ہستی موہوم فنا ہوجائے ——— وہ ہستی موہوم جس نے سالک کی آنکھوں پر حجاب ڈال کر اسے وجود مطلق، جو اس کی حقیقت ہے، کے مشاہدہ سے محروم کر رکھا ہے۔ بس اسی مقصدِ عالی کی خاطر یہ سب حیلے نکالے گئے ہیں جب غلبۂ حال سے سالک کو اپنے آپ کا علم نہ رہے اور غیر تو درکنار اپنے علم کا علم بھی نہ رہے تو "فنا" حاصل ہوئی۔ اور جب اس علم کا علم بھی باقی نہ رہے تو اسے "فنائے فنا" کہیں گے۔ سالک جتنا اپنے آپ سے گذرا اور بیخود ہوا اتنا ہی مطلوب سے واصل ہوا۔

آنقدر کز خویشتن رفتم در آغوشِ تو ام

حاصل کلام یہ ہے کہ سالک اپنے اندر ایک نسبت پاتا ہے مگر نہیں جانتا کہ اس نسبت

کا دوسرا سرا کہاں ہے، کس کے ساتھ مربوط ہے۔ اب وہ اس سرے کو جس شے کے ساتھ بھی جوڑے گا لامحالہ اس شے کا ایک "تعین" ہوگا۔ اور حضرت مطلوب ومقصود جل شانہٗ یقیناً اس کے ماوراء ہے۔ بلکہ سالک جس مرتبے میں بھی رکے مطلوب اس کے ماوراء ہے، کیونکہ جو شے سالک کے احاطۂ تصور میں آئے گی وہ بالضرور ایک ایسا متعین ہوگا جس کے تعین کو سالک کا ذہن محیط ہے۔ جو شے کسی قید اور تشخص کے ساتھ مقید و متشخص ہو وہ ہرگز مطلوب (جل شانہٗ) نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ مطلق کی کُنہ تک کوئی نبی یا ولی نہیں پہنچ سکا ہے

عنقا شکارِ کس نشود، دام باز چیں　　　　ایں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

عنقا کسی کا شکار نہیں ہوتا، اپنا جال اٹھا لے۔ یہاں جال کے ہاتھ سوائے ہوا کے اور کچھ نہیں آتا۔

لہٰذا سالک یوں سمجھے کہ میں اس کی طرف متوجہ ہوں لیکن مجھے پتہ نہیں کہ میں کس سمت، کس جہت میں متوجہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر، وہ جانتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ کیا جانتا ہے۔ یہ "فنا" کا مرتبہ ہے۔ اور اگر وہ جانتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ کیا جانتا ہے اور نیز یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ جانتا بھی ہے تو یہ "فنارِ فنا" کا مرتبہ ہے جو "سیر الی اللہ" کا آخری مرتبہ ہے۔ اس سے آگے "سیر فی اللہ" شروع ہو جاتی ہے۔

لقمہ　　فنا کی دو قسمیں

فنا کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اِس صورت میں حاصل ہوتی ہے کہ سالک "علم مرکب" رکھتا ہو اور دوسری قسم جب کہ سالک کا علم "بسیط" ہو جائے۔

علم مرکب سے وہ ادراکی کیفیت مُراد ہے جو سالک کے باطن میں پیدا ہوتی ہے اور جملہ ماسوٰی سے منقطع ہو کر صرف حضرتِ مقصود کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ اِس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ جو بھی شے سالک کے ادراک میں آتی ہے وہ صفتِ غیریت کے ساتھ مدرک نہیں ہوتی بلکہ سالک اس میں عینیت

کو ملاحظہ کرتا ہے، یہاں تک کہ شیون و تعینات کا لباس (جس میں وہ شے ملبوس ہے) بھی سالک کے نزدیک کوئی خارجی وجود نہیں رکھتا اور سالک اپنے اس ادراک کو حقیقی اور مطابق واقع جانتا ہے۔ چنانچہ قایلین وحدۃ الوجود نے اس کی بہت وضاحت کی ہے۔ یا پھر اس کا سبب سالک کی اپنے مقصود کی طرف انتہائی توجہ، مطلوب کا غایت ملاحظہ اور اپنے دوست کے ساتھ فرط محبت ہے۔ لہٰذا قوتِ عشق کی شدت کی بنا پر جو کچھ اُس کے ادراک میں آتا ہے وہ اسے مقصود و مطلوب اور دوست ہی دکھائی دیتا ہے اس کا غیر نظر نہیں آتا۔ اگرچہ دراصل ایسا نہیں ہے، بلکہ فی الواقع یہ متکثر و متغایر وجود ہی ہیں جو حضرتِ واجب الوجود کے وجودِ خاص سے ہیں، مگر انتہائی شغف کے باعث سالک کو ایسا نظر آتے ہیں۔ اور "ہمہ اوست"، مطابق واقع نہیں ہے بلکہ جھوٹ ہے۔ چنانچہ قایلینِ وحدۃ الوجود نے خیال خام کو پکایا ہے۔

کچھ بھی ہو، غیر کو اس کی غیریت کے لحاظ سے مٹا دینے پر ہر دو فریق متفق ہیں۔ لہٰذا سالک نے علوم متکثرہ سے گریز کر کے علمِ واحد میں پناہ لی ہے، اور اس توحید کے ذریعہ تقربِ الٰہی حاصل کیا ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ سالک کو ابھی علم ہے کہ وہ علم رکھتا ہے اور اسی بنا پر اس کا علم "علم مرکب"، کہلاتا ہے۔ یعنی سالک ایسا علم رکھتا ہے جس کی نسبت یا اضافت دوسرے علم کی طرف ہے ؎

تا در تو ز پندارِ تو ہستی باقیست

میداں بیقین کہ بت پرستی باقیست

جب تک تجھ میں اپنا پندار باقی ہے، یقینی طور پر جان لے کہ ابھی تو بت پرستی میں مبتلا ہے۔

اب رہا علم بسیط تو اس سے مراد یہ ہے کہ سالک اپنی کیفیت ادراکیہ کے ساتھ اپنے مقصود کی طرف اس طرح متوجہ ہو کہ جملہ ماسویٰ سے منقطع ہو جائے حتیٰ کہ اسے یہ علم بھی باقی نہ رہے (کہ میں منقطع ہو چکا ہوں)۔ اس مقام پر کہا جاتا ہے کہ سالک کا علم بسیط ہو گیا ہے اور اسے فنائے حقیقی حاصل ہو گئی ہے۔

بعض نے علم مرکب کو فنا اور علم بسیط کو فنائے افنا بھی کہا ہے۔ یہ دونوں مراتب کسبی نہیں

ہیں بلکہ وہبی ہیں اور ان کا فیضان حق تعالےٰ شانہٗ کی بارگاہ سے ہوتا ہے۔ سالکین کا سلوک نہ اس میں کوئی تاثیر رکھتا ہے نہ کچھ دخل۔

بجستجوے نیابد کسے مُراد، وے
کسے مُراد بیابد کہ جستجو دارد

جستجو سے کوئی شخص مُراد کو تو نہیں پاتا، لیکن مراد اسی کو ملتی ہے جسے اس کی جستجو ہو۔

یہ جذب و بےخودی اور غیبت کا انتہائی مرتبہ ہے اور کسی کسی سعادت مند کو نصیب ہوتا ہے۔ اس کی کچھ نشانیاں ہیں، ہر مدعی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ سالک جب تک مرتبہ جذب و بے خودی کو نہ پالے ولایت کی صف میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس جذب کے بغیر وہ زاہدوں، عابدوں اور اخیار و ابرار میں سے تو ہو سکتا ہے" قرب وصول" تک جسے ولایت بھی کہتے ہیں اس کی رسائی نہیں ہوتی۔

جاننا چاہئے کہ ولایت کے لئے جذبہ شرط ہے مگر اس کا دایمی ہونا شرط نہیں ہے۔ چنانچہ بعض لوگ ایسے ہیں جو برسوں جذب اور حالتِ سُکر میں رہتے ہیں اور پھر اس کے بعد حالتِ صحو یا ہوش میں آجاتے ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ تیس سال تک اس مقام میں رہے۔ اور بعض ایسے ہیں جو صرف ایک ساعت کے لئے مجذوب رہے۔ جو مجذوبین اس مرتبے میں مقید ہو گئے اور جنھوں نے یہاں سے عروج نہ کیا اور صحو میں نہ آئے وہ اس وجہ سے مراتب کے لایق نہ رہے۔ لیکن وہ مشایخ عظام جو تختگاہِ ہوش کے پادشاہ اور انبیائے کرام کے خلیفہ و نایب ہیں، اس دولت سے فایز المرام ہیں۔

تتمہ بقا باللہ

بقا باللہ سے مُراد مرتبۂ جمع الجمع ہے جو حیرتِ کبریٰ کا جالب ہے۔ یہ حیرت کبریٰ اکثر محققین

کے نزدیک آخری مقام ہے اگرچہ بعض نے تسلیم و رضا کو آخری مقام قرار دیا ہے۔

بقاباللہ، رجوع الی البدایت[1] کا نام ہے۔ "بدایت" مرتبہ تفرقہ ہے جس میں اشیاء کا ادراک ان کے تعینات کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اس مرتبہ میں مبتدی کی نگاہ، ظاہر کو نہ دیکھتے ہوئے بھی، مظاہر کی دید میں پابند ہوتی ہے اور غفلت تامہ اس کے شامل حال رہتی ہے۔ پھر سالک یہاں سے ترقی کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے تو اسے غیبت و بے خودی اور جذب کامل حاصل ہوتا ہے، قیود و تعینات رفع ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے تشخصات اور اضافتیں محو ہو جاتی ہیں۔ جب سالک اس مرتبہ کو پالیتا ہے تو اس کے بعد وہ پھر "اعتبار تعینات"، اور طمس تشخصات و اضافات کی طرف لوٹتا ہے۔ لیکن اب وہ (ان تعینات وغیرہ کو) ابتدائے حال کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ اب اس کی نظر دوسری ہوتی ہے۔ اگرچہ ان دونوں مراتب (یعنی بدایت و نہایت) میں "اعتبارِ تعینات" ایک قدرِ مشترک ہے اور اس لحاظ سے ان کو ایک دوسرے کا شریک کہا جا سکتا ہے، تاہم ان دونوں میں بڑا جلی اور واضح فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ (مرتبۂ) اوّل میں سالک کے پیشِ نظر صرف "امور متعینہ و متشخصہ و مقیدہ" ہوتے ہیں۔ اس کا دل انہی کی طرف متوجہ رہتا ہے اور یہی اس کا مطلوب و مقصود ہوتے ہیں۔ "امر مطلق"، کے مطالعہ و ملاحظہ کا کہیں پتہ بھی نہیں ہوتا لیکن (مرتبۂ) ثانی میں سالک کا مطلوب و مقصود صرف "ذات مطلق"، ہوتی ہے۔ اس کا دل اس کے سوا اور کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس مرتبہ میں سالک تعینات و تشخصات اور اعتبارات کو حق تعالےٰ شانہٗ کے اسماء و صفات کے مظاہر کی حیثیت سے دیکھتا ہے، چنانچہ وہ جس طرح (مرتبۂ) اول میں جلال و جمال کے درمیان فرق کرتا

---

[1] : "رجوع الی البدایت"، کا مطلب ہے بدایت یا ابتدا کی طرف لوٹنا۔ اس مرتبہ کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے مثلاً بقاباللہ، بقاء بعد فنا، جمع الجمع، فرق بعد الجمع، فرقِ ثانی، صحو ثانی وغیرہم۔ اس مرتبہ کی تعریف کرتے ہوئے یوں کہا گیا ہے:

النہایت رجوع الی البدائیت

انتہا، ابتدا کی طرف لوٹنے کا نام ہے۔

تھا، اب (مرتبۂ ثانی میں بھی اسی طرح فرق کرتا ہے لیکن اب دوسری آنکھ سے اور کسی اور نگاہ سے۔
مرتبہ ثانی میں بعض لوگ جب مخلوقات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو پہلے ذاتِ مطلق کا ملاحظہ کرتے ہیں اور پھر اس کے نور سے تعینات و اضافات کو دیکھتے ہیں۔ اور بعض مشاہدہ اشیاء میں ذاتِ مطلق کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ وہ ہیں جو مشاہدۂ اشیا کے بعد ذاتِ مطلق کا مشاہدہ کرتے ہیں چنانچہ ان میں (بالترتیب) ایک کہتا ہے:

مَارَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَرَأَیْتُ اللّٰہَ قَبْلَہٗ

میں نے جس شے کو بھی دیکھا اس سے پہلے خدا ہی کو دیکھا

اور دوسرا کہتا ہے:

مَارَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَرَأَیْتُ اللّٰہَ فِیْہِ

میں نے جس شے کو بھی دیکھا اللہ تعالیٰ ہی کو اس میں دیکھا

اور ایک اور یوں کہتا ہے:

مَارَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَرَأَیْتُ اللّٰہ بَعْدَہٗ

میں نے جس شے کو بھی دیکھا اس کے بعد خدا ہی کو دیکھا

غرضیکہ ہم لوگوں میں سے ہر ایک کا ایک مقامِ معین ہے۔
عارف جب مقامِ آخر (یعنی مرتبۂ بقا باللہ) میں پہنچ جاتا ہے تو عوام الناس کے لئے اس میں اور دوسرے انسانوں میں فرق معلوم کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس حدیثِ قدسی کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ:

اَوْلِیَائِیْ تَحْتَ قَبَائِیْ لَا یَعْرِفُہُمْ غَیْرِیْ

میرے اولیا میری قبا کے نیچے (پوشیدہ) ہیں۔ ان کو میرے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔

اسی مقام پر بعض عامیوں نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کرتے ہوئے) کہا تھا کہ:

مَالِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ

اس پیغمبر کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

اسی مقام کی خبر دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔

کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تجارت اور خرید و فروخت انھیں ذکر الٰہی سے نہیں روکتی۔

غرضیکہ اہل اللہ کو جو مرتبۂ کمال کو پہنچے ہوئے ہوں، پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ظاہر دوسرے لوگوں کے ظاہر کی مانند ہوتا ہے۔ برخلاف ان کے مجذوب اور مجنون ہیں کہ ان کے اطوار چونکہ عام لوگوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں اس لئے عوام ان میں بڑی آسانی کے ساتھ امتیاز کر لیتے ہیں اور ان سے بڑی عقیدت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

اہل صحو میں سے جو حضرات "فردیت حقیقت" کے مقام میں ہوتے ہیں ان سے خوارق کا ظہور بہت کم ہوتا ہے کیونکہ ان کی توجہ ہمہ وقت ذات بحت و بے رنگ کی طرف مبذول رہتی ہے جبکہ انفس و آفاق میں جو بھی تصرف کیا جائے گا وہ تاثیرات صفات سے آگاہ ہوگا۔ جو لوگ اس مقام (یعنی مقام فردیت حقیقت) سے جتنا فروتر ہوں گے اتنا ہی ان سے خوارق اور تصرفات کا ظہور ہوگا اس مقام کی تفصیل احاطۂ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس پر یہ آیۂ کریمہ شاہد ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّىْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ

کہہ دو کہ اگر سمندر میرے رب کے کلمات (کو لکھنے کے لئے) سیاہی بن جائے تو میرے

اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّىْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا

رب کے کلمات ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اور اگر اتنی ہی سیاہی اور بھی لے آئیں (تو وہ بھی ناکافی ہوگی)۔

برادرِ عزیز! یہ چند سطریں جو میں نے لکھی ہیں اگر تم نے نگاہِ دل سے ان کا مطالعہ کر لیا تو قوی امید ہے کہ ظاہرِ کار میں تم اپنے آپ کو بلاواسطۂ شیخ پستی سے نکال کر بلندی کی طرف لے جاؤ گے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ کام شیخ کی توجہ اور مدد کے بغیر نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ اس راہ میں بے شمار ایسی خطرناک اور دشوار گذار گھاٹیاں ہیں جن میں سے صرف شیخ کی امدادِ باطنی نکال کر لے جا سکتی ہے۔ کتابوں کا مطالعہ اس جگہ کچھ کام نہیں آتا۔ بعض خود بین اور خود پرست لوگوں کو تم دیکھو گے کہ وہ اس بات کے بہت مشتاق ہوتے ہیں کہ نہ وہ کسی شیخ سے بیعت ہوں اور نہ کسی خدارسیدہ کی صحبت کی پابندی اختیار کریں۔ بس ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ کسی کتاب کے ذریعہ ذکر و فکر اور دوسرے امور کی تکمیل کر لیں۔ لیکن یہ بعید از امکان بات ہے۔

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ

اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان سچا فیصلہ کر دے اور تو ہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

اے طلبگارِ حق! اللہ تجھ پر اپنی راہ کھولے، اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اذکار و افکار اور مراقبات کی جتنی بھی قسمیں ہیں ان سب کا مقصود ایک ہے، اور وہ ہے محویت و فنا۔

ابتدائے فطرت میں لطیفۂ ربانیہ عزیمت کی یکسوئی اور جمعیت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے مخلوق سے رابطہ بڑھتا جاتا ہے اور تعلقاتِ دنیوی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، عزیمت کی وحدت کثرتِ عزائم میں بدلتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ جمعیت کی بجائے تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ صاحب انصاف کی ہمت کا تقاضا یہ ہے کہ پھر اسی وحدت و یکسوئی کی طرف متوجہ ہو اور لطیفۂ ربّانیہ میں جو پراگندگی اور انتشار پیدا ہو چکا ہے اسے توحید کے رابطہ سے درست کرے۔ اس مقصد کے حصول کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اپنے علم کو "بسیط" کرے اور متفرق و منتشر راہوں کو چھوڑ کر یکسوئی اختیار کرے یہاں تک کہ جملہ ذوات میں ذاتِ حق، صفات میں صفاتِ حق اور افعال میں افعالِ حق کو دیکھے۔ تب اس کی سمجھ میں یہ راز آئے گا کہ وجودِ حق تمام مخلوقات کے وجودوں میں کیونکر ساری ہے۔ جب یہ حالت حاصل ہو جائے گی تو وہ ایمانِ حقیقی اور کمالِ تقویٰ سے متصف ہوگا اور اس پر واضح ہو جائے گا کہ جنت کیا ہے اور دوزخ کیا ہے، دنیا کیا ہے اور آخرت کیا ہے، نفس کیا ہے شیطان کون ہے اور رحمان کون ہے، ہادی کون ہے اور مُضِلّ کون ہے۔ اگرچہ عارف کو ان باتوں

کے دریافت کرنے سے غرض نہیں ہوتی تاہم، بحکم شہود، اس سے چارہ بھی تو نہیں۔

درحقیقت اذکار و افکار اور مراقبات کے جتنے طریقے ہیں سب کی بنیاد عشق پر ہے۔ عشق جس قدر بڑھا ہوا ہوگا اتنی ہی ان امور میں تاثیر ہوگی، جتنی عشق میں سستی ہوگی اتنی ہی ان کی تاثیر میں کمی ہوگی۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان امور کو پابندی کے ساتھ کرتے رہنے سے محبت کی ٹوٹی ہوئی ڈوری پھر سے جڑ جاتی ہے اور یہ رشتہ محکم و استوار ہو جاتا ہے۔

اذکار و افکار اور مراقبات کو حصولِ ثواب کی نیت سے ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ عاشق کی شان اس سے کہیں بلند ہے۔

لمعہ — اشعار جن میں توحید کا بیان ہو

جس طرح مذکورہ اذکار سے توحید کے معنیٰ آشکار ہوتے ہیں، اسی طرح ہر زمانے میں ابیات و اشعار سے بھی ان معانی کا اظہار ہوتا ہے۔ وصول الی اللہ کے ضمن میں، اذکار کی طرح، ابیات و اشعار بھی نافع ہیں۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ عربی زبان کو چونکہ مظہر اتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک نسبت ہے اس لئے اس کی تاثیر زیادہ ہے۔ اگرچہ ہر زبان کی نسبت حقیقتِ نبوی کے ساتھ یکساں ہے تاہم عربی کی نسبت قوی تر ہے۔

لمعہ — برزخ

مشایخ علیہم الرحمہ نے (اذکار وغیرہ کے لئے) جو برزخ مقرر کیا ہے اس سے مقصود پراگندگی کو دُور کرنا اور متفرقات کو مجتمع کرنا ہے۔ آدمی ہجومِ خطرات اور تفرقۂ حواس کے باعث توحید علمی سے محروم رہ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں یہ برزخ ہی ہے جو اسے جمعیتِ حواس مہیا کرتا ہے

بالخصوص اگر برزخ ادب خواہ ہو تو اس (برزخ کی) وہمی یا حقیقی صورت دیکھتے ہی سالک اس کے حضور میں خشوع وخضوع طاری ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اس کی شان ہے کہ وہ ادب کا تقاضا کرتا ہے اور یہ بات بے حد فایدہ مند ہے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ سالک کے دل میں ان معانی کے واسطے جو اس برزخ میں ودیعت کئے گئے ہیں زبردست اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ خیال کو جس شے کی طرف لگا دیا جائے وہ اسی کا رنگ ڈھنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال کی صفت "ہیولانی" ہے اور اس میں صورت کو قبول کرنے کی بے حد صلاحیت ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا رومیؒ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں ؎

اے برادر، تو ہمین اندیشۂ
ما بقی، تو استخوان و ریشۂ

اے بھائی، تو وہی کچھ ہے جو تو خیال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے (وہ تو نہیں بلکہ محض) ہڈیاں اور رگ پٹھے ہیں۔

گر گل است اندیشۂ تو گلشنی
ور بود خارے، تو ہیمۂ گلخنی

اگر تیرے خیال میں پھول بس رہا ہے تو تو گلشن ہے اور اگر کانٹا ہے تو پھر تو بھاڑ کا ایندھن ہے۔

برزخ ہر مخلوق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ برزخ کے معنی واسطہ کے ہیں، دل اور مقصود کے درمیان مقصود جو انتہائے لطافت اور تنزہ کے باعث احاطۂ ادراک میں نہیں آسکتا۔ لہٰذا اس کے جمال کو جس شے میں حاضر کیا جاتا ہے۔ وہ برزخ ہے۔ ذرے سے لے کر آفتاب تک اور عرش سے لے کر فرش تک (ہر شے) اس کی جلوہ گاہ ہے۔ اگر چشم بینا ہے تو جس چیز پر نگاہ ڈالو گے وہی نظر آئے گا۔ البتہ برزخوں میں تفاوت ہے۔ مثلاً شیخ جن معانی کا مورث ہے وہ بات ہی کچھ اور ہے جو کنکر پتھر کے برزخ سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان چیزوں کا برزخ بالکل مختلف معنی کا مورث ہے۔

برزخ جس قدر لطیف اور عقلی ہوگا اتنا ہی بہتر کام بنے گا۔ اس کے برعکس برزخ جتنا کثیف اور مرئی صورت کا حامل ہوگا کام اتنا ہی زبون اور خراب ہوگا۔ مشایخ کرام ہر سالک کی استعداد کے مطابق اس کے لئے برزخ مقرر فرماتے ہیں، اس ناچیز کی رائے میں سالک کی حالت کو اچھی طرح دیکھنا چاہیئے کہ اس کے نفس میں کونسی شے زیادہ وقعت رکھتی ہے اور کیا چیز اس کی نگاہ میں جمال کی حامل ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی لڑکے پر عاشق ہے اور اس کی محبت میں والہ و شیدا ہے۔ تو لامحالہ اس شخص کی نگاہ میں اس لڑکے کا جمال اپنے شیخ کے جمال سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ شیخ اس کے لئے اپنا برزخ تجویز نہ فرمائیں بلکہ اشغال و مراقبات میں اس لڑکے کا برزخ مقرر کریں کثرت اشغال سالک کو بتدریج اس بھنور سے بھی نکال لے گی اور تعلق صوری سے تعلق معنوی کی طرف لے جائے گی۔ ایک اور مثال ایسے شخص کی ہے جسے پھول اور چمن بہت پسند ہوں اور اس کی نگاہ میں ان سے بڑھ کر اور کوئی شے جمیل نہ ہو۔ اب ایسے شخص کے لئے شیخ اگر اپنے جمال کو برزخ مقرر کریں گے تو ان کا جمال وہ نتایج پیدا نہ کر سکے گا جو اس کی محبوب شے یعنی پھولوں اور پھلواریوں کے برزخ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ البتہ، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، اشغال کے باعث وہ بالآخر اس ورطہ سے نکل آئے گا۔ اسی طرح اوروں پر بھی قیاس کر لو۔

تتمہ — حرارتِ باطنی

حبس نفس، حصر نفس، ذکر دوضربی، چارضربی، شش ضربی اور ذکر حدّادی وغیرہ جو شدید حرکات پر مشتمل ہیں، ان سب کا مقصد باطن میں حرارت پیدا کرنا ہے۔ یہ حرارت عشق اور اشتیاق کو جنم دیتی ہے اس سے سالک میں ایک جوش و خروش پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل میں محبت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ نوجوانوں میں ذکر سے بہت جلد فایدہ ظاہر ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ صوفی تیس برس کے بعد سرد ہو جاتا ہے۔

البتہ بچپن میں ذکر کی تلقین نہیں کرتے کیونکہ ذکر کی حرارت جلا دیتی ہے۔ جب بلوغت کو پہنچ جائے تو پھر یہ تلقین روا ہے۔ جوانی کے ایام میں سالک جتنی محنت و مشقت کر سکتا ہے وہ بڑھاپے میں ممکن نہیں ہے۔ شہود اور کشف جو اوائل عمر میں ہوگا وہ آخری عمر میں نہیں ہو سکتا۔ شیخ نظام الدین نارنولی علیہ الرحمہ ایسے سرد خون صوفیوں کو تخم پنواڑ کھانے کو فرمایا کرتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ نباتی دواؤں سے ان لوگوں کے اندر سوزش اور گرمی پیدا ہو۔

تتمہ صوتِ سرمدی

گذشتہ اشغال و اذکار میں جو حرکتِ قلب، صوتِ سرمدی اور توالیٔ انفاس[1] وغیرہ کو اختیار کیا گیا ہے، اس میں یہ راز ہے کہ یہ تمام امور اُس عمل کو جو تقرب و تواصل کا موجب ہے، اپنی معیاریت[2] سے دایم الوقوع بنا دیتے ہیں۔ چونکہ ان امور کا دوام اور اتصال ثابت ہے لہٰذا جس شے کا یہ معیار ہوں گے وہ شے بھی دایم الوقوع ہوگی۔ ان امورِ دایمی کے علاوہ اگرچہ ان کے مثل اور امور بھی ہیں جن کو

---

[1] :- توالیٔ انفاس یعنی سانسوں کی پیہم آمد و رفت۔

[2] :- معیاریت : مراد شمولیت ہے۔

سونے، چاندی کے سکّے یا زیورات وغیرہ بنانے میں ان دونوں قیمتی دھاتوں کے ساتھ ایک خاص مقدار میں کمتر درجے کی دھاتوں، مثلاً تانبا وغیرہ کا شامل کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ مطلوبہ شے پایدار ہو اور اس کی شکل و صورت قایم رہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو سونا یا چاندی اپنی طبعی نرمی کے باعث دستکار کی بنائی ہوئی صورت کو قایم نہیں رکھ سکتے۔ لہٰذا زیورات وغیرہ میں دو قسم کے اجزا ہوتے یعنی ایک جزو قیمتی دھات (سونا یا چاندی) کا اور دوسرا جزو ملاوٹ کا۔ اصطلاحاً انہی اجزا میں سے اوّل الذکر کو "عیار" اور مؤخر الذکر کو "معیار" کہا جاتا ہے۔ گویا معیار بمنزلہ ایک ظرف یا برتن کے ہے جو عیار کو اپنے وجود کے ساتھ سنبھالتا

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

معیار بنایا جاسکتا ہے جیسے افلاک اور نجوم کی حرکت یا تجدد امثال یا دریا وسمندر کا پانی کہ یہ دائمی ہیں لیکن اس میں یہ بات ہے کہ یہ امور چونکہ آدمی کے جسم سے الگ اور خارج ہیں اس لئے اس کی توجہ سے بہت بعید ہیں۔ ان کی طرف متوجہ ہونا، آدمی کے اپنے اندر توجہ کرنے کے برابر نہیں ہوسکتا۔
یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے (اور وہ یہ کہ آدمی کے اپنے اندر بھی تو تجددِ امثال کا سلسلہ جاری ہے) یعنی ہر لمحہ اور ہر آن آدمی کا رنگ معدوم ہو جاتا ہے اور پھر اس کا مثل عدم سے وجود میں آجاتا ہے۔ یہ بھی دوام کے ساتھ ہو رہا ہے تو پھر اس تجدد امثال کو (اس علم کا) معیار کیوں نہیں بنایا جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اَلوان یا رنگوں کا تعلق آنکھ سے ہے اور مراقبات، بلکہ اذکار میں بھی، آنکھوں کو بند رکھنا نہ صرف سودمند بلکہ نہایت ضروری ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ تجدد (جو وجود انسانی میں واقع ہو رہا ہے) بدیہی نہیں، نظری ہے۔ کئی کمزور قسم کے مقدمات قایم کرنے کے بعد اگر ہم اس مطلب کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو یہ محض ایک ظنی ثبوت ہوگا۔

لقمہ غلبۂ شوق

وہ نغمۂ آتشیں جو سالک کی نہاد میں خوابیدہ ہے، فرطِ محبت سے بھڑک اٹھتا ہے۔ شروع شروع میں گریہ وزاری اور بیقراری کا اظہار ہوتا ہے، تند و تیز حرکات اس سے سرزد ہوتی ہیں اور

(بقیہ حاشیہ)

یا محفوظ رکھتا ہے۔ ایک لمتر دھات کی کسی قیمتی دھات کے ساتھ اس مقصد کے لئے شمولیت یا ملاوٹ اس کی معیاریت کہلاتی ہے۔ مندرجہ بالا عبارت میں بھی یہی صورت حال ہے۔ یعنی حضرت مصنف علیہ الرحمہ نے اشتغال و اذکار کو "عیار"، اور حرکت قلب وغیرہ کو معیار قرار دیا ہے۔

آنکھ، ناک اور منہ سے رطوبات جاری ہو جاتی ہیں۔ یہ درد کا عالم ہے جو کثرت ذکر سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ مقام تحیر میں پہنچ جاتے ہیں وہ فراق سے نہیں روتے۔ ان کا رونا تو وصال میں ہوتا ہے بلکہ وصال میں وہ لوگ ان امور پر روتے ہیں جو ان سے چھوٹ گئے ہوں یا جن کا تعلق عشق کے معاملات سے ہو۔ دونوں میں ایک فرق یہ بتایا جاتا ہے کہ عین وصل میں رونے والوں کے آنسو میٹھے ہوتے ہیں جب کہ درد فراق سے رونے والوں کے آنسو نمکین اور تلخ ہوتے ہیں۔ یہ (واصلین) جب رقص کرتے ہیں تو ان کی حرکات بہت سبک ہوتی ہیں اور ان میں ایک ملائمت اور موزونیت پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ اکثر لحن کے وزن پر رقص کرتے ہیں۔ اسے "نواطق روحانی" کہا جاتا ہے۔ یہ ان کے انشراح صدر اور خوشں وقتی کی دلیل ہے۔ اگرچہ عوام اس قسم کے رقص کو معتبر نہیں گنتے اور سماع یا جم سے انشراح حاصل کرتے ہیں لیکن خواص اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی حرکت (یعنی رقص) کا سرچشمہ کیا ہے، یعنی یہ "جود قلب" ہے۔

مجلس میں جو شخص سب سے پہلے رقص کے لئے اٹھتا ہے اور جو کچھ وہ رقص میں کرتا ہے (اس کی بنا پر) پھر مجلس کا جو بھی رنگ ہو اس کی ذمہ داری اسی پر ہوتی ہے۔ اگر یہ خیر ہے تو (اس کے ذمہ) خیر ہے اور اگر شر ہے تو شر۔ سلطان المشائخ فرمایا کرتے تھے کہ اگر صوفی کی پیٹھ زمین پر لگ جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو یا اپنے لباس کو فدا کر ڈالے۔

امام قشیری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ یہ حرکت جس کسی سے بھی صادر ہو، خواہ وہ مبتدی ہو، متوسط ہو یا منتہی، اس کے حال میں اس سے کچھ نہ کچھ نقصان ضرور آئے گا۔ لہٰذا جب تک ہجوم و غلبہ نہ ہو اپنی جگہ سے نہ ہلے اور جہاں تک ہو سکے، ثابت و راسخ رہے۔

الحمد للہ! کہ یہ رسالہ آخر ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ ہجری میں اختتام کو پہنچا۔ اب میں نہایت خلوص اور صدق دلی کے ساتھ بدرگاہ رب العالمین دعا کرتا ہوں کہ اے میرے پروردگار! تو میری اس ناچیز تصنیف کو مقبول خلائق بنا اور کاہل الوجود اور بدنام کنندۂ طالبوں کے ہاتھوں سے اسے محفوظ و مصون رکھ! اور یہ میں مانگتا ہوں تیرے حبیب پاک سید الابرار والہ الاطہار کی طفیل سے صلی اللہ تعالیٰ علیٰ رسول خیر خلقہ محمد وآلہ وبارک وسلم۔ آمین! تمت بالخیر۔